ماہنامہ
قلندر شعور
ستمبر ۲۰۱۹ء

سکون زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے
اور روح کے عرفان کے بغیر سکون نہیں ملتا

جلد 7 شمارہ 8 | ستمبر 2019ء | محرم ـ صفر 1441ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ شعور کراچی

قلندر شعور

Neutral Thinking

(اردو ـــ انگریزی)

سرپرست اعلیٰ

حضور قلندر بابا اولیاء رحمۃ اللہ علیہ

چیف ایڈیٹر

خواجہ شمس الدین عظیمی

ایڈیٹر

حکیم سلام عارف

سرکولیشن منیجر

محمد ایاز

بااہتمام عظیمی یونیورسٹی پریس ـــ پبلشر شاہ عالم عظیمی نے ابن حسن آفسیٹ پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم، کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

فی شمارہ 70 روپے..... سالانہ ہدیہ 950 روپے رجسٹرڈ ڈاک کے ساتھ، بیرونِ پاکستان 60 امریکی ڈالر سالانہ

B-54، عظیمی محلّہ، سیکٹر C-4 سرجانی ٹاؤن کراچی، پاکستان۔ فون نمبر: 6912020 213 (0) 92+

۳۷ مضامین کا گُل دان

حمد باری تعالیٰ	پروفیسر تلوک محرومؔ	10
نعت رسول مقبول ﷺ	کوثر نیازی	11
رباعیات	ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ	12
آج کی بات	مدیر مسئول	14
فقیر کی ڈاک	ادارہ	18
نامے میرے نام	خانوادہ سلسلہ عظیمیہ	20
ا ب ج د	گلِ نسرین	25
پیرا سائیکالوجی ــ مسائل کا حل	خواجہ شمس الدین عظیمی	29
پھولنا اور سمٹنا خمیر ہے	ڈاکٹر نعیم ظفر UAE (Ph.D.)	33
ابھی مت جاؤ ــ رک جاؤ	عابد محمود	41
نگاہوں کو زباں دل کو نظر دی جائے	نفیسہ شاکر	47
حسرتوں کی سرخی	عثمان طاہر	51
پڑھ رہے تھے وہ شبنم سے کر کے وضو	صوفیہ رفعت (UK)	57
لوہا ــ؟	حامد ابراہیم (M.A-Fine Arts)	61
جون 2019ء کے سرورق کی تشریح	قارئین	66
اللہ جمیل و یحب الجمال	حماد علی شاہ	69
پُراسرار مقامات	نیرّ اعظم	75

سفر جاری ہے	ملک محمد ناصر	81
شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ	قرۃ العین واسطی (M.A-Mass Comm.)	87
دنیا کھیتی ہے	ادارہ	93
بھولے خان	سید اسد علی (MBA)	95
گھر آیا تو......؟؟؟	سارہ خان (M.A-Mass Comm.)	101
خیالات کی دنیا	طاہر محمود (M.Sc-Physics)	109
67 کروڑ......؟	شاہد احمد (UAE)	113
اقتباسات	قارئین	119
پورب کے ہمزاد	محمد عدنان خان (M.Sc-Applied Physics)	121
اللہ میاں کے باغ کے پھول — اولی الالباب بچے	ادارہ	126
اللہ میاں کے باغ کے پھول — بڑا آدمی	بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق	128
اللہ میاں کے باغ کے پھول — لوہا اور پیاز	حسن زمان	132
آپ کے خواب اور ان کی تعبیر	عظیمی خواجہ شمس الدین	135
What Do We See?	Dr. Naeem Zafar (Ph.D.)	146
Prophet Jesus (PBUH)	Extracted	149
The Borrowed Child	Roshan Sitara	152
Physical Record of the Mind	Dr. Muzaffaruddin	158
Oneness	Bibi Anuradha (UAE)	162
A Secret Keeper	Muhammad Zeeshan	168
Message of the Day	K. S. Azeemi	172

پروفیسر تلوک محرومؔ

حمد باری تعالیٰ

ہر سمت اک ظہور ہے تیرے جمال کا
تو نور شرق و غرب و جنوب و شمال کا

ماہ تمام نیم تبسم ہے اک ترا
خورشید اک شِمہ* ہے تیرے جلال کا

پائی ہے تجھ سے چشم کواکب نے روشنی
تمغہ دیا ہے بدر کو تو نے کمال کا

دیتا ہے ناتواں کو تو توانائی عروج
اوج فلک سے ہے یہ اشارہ ہلال کا

تو ہے نہاں مگر تیرے جلوے کہاں نہیں
ہر لختِ سنگ آئنہ تیرے جمال کا

خود اس کے حسن کو بھی تماشا کرے کوئی
صانع جو روئے گل کا ہے چشم غزال کا

محرومؔ اک امید پہ ہوں گرم جستجو
''لاتقنطوا'' جواب ہے میرے سوال کا

ہر سمت اک ظہور ہے تیرے جمال کا
تو نور شرق و غرب و جنوب و شمال کا

*شمہ (ذرا سا)

نعت رسولِ مقبول ﷺ

خورشید رسالتؐ کی شعاعوں کا اثر ہے
احرام کی مانند مرا دامنِ تر ہے

نظارۂ فردوس کی یارب نہیں فرصت
اس وقت مدینہ کی فضا پیشِ نظر ہے

اس شہر کے ذرّے ہیں مہ و مہر سے بڑھ کر
جس شہر میں اللہ کے محبوبؐ کا گھر ہے

یہ راہ کے کنکر ہیں کہ بکھرے ہوئے تارے
یہ کاہکشاں ہے کہ تری گردِ سفر ہے

اس صاحبِ معراج کے در کا ہوں بھکاری
قرآن میں جس کے لئے ''مازاغ البصر'' ہے

اک مہرِ لقا، ماہِ ادا کا ہے یہ اعجاز
ہر اشک مری آنکھ کا تابندہ گہر ہے

میں گنبدِ خضرا کی طرف دیکھ رہا ہوں
کوثرؔ مرے نزدیک یہ معراجِ نظر ہے

داستانِ پارینہ

یہ طاق یہ ٹوٹے ہوئے در اور دیوار
ذروں میں نظر آتے ہیں سارے آثار
ذروں میں ہے گرم شاعروں کی محفل
ذروں میں ہیں بند شاعروں کے اشعار

’’اور کتنی ہی ایسی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی معیشت پر اترا گئے تھے۔ سو دیکھ لو، ان کے مسکن پڑے ہوئے ہیں جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے۔ آخر کار ہم ہی وارث ہیں۔‘‘ (القصص:۵۸)

ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ کی یہ رباعی انتہائی فکر انگیز اور منفرد تصورات و احساسات کی حامل ہے۔ ابدالِ حق فرماتے ہیں — دنیا اور دنیا کی رونق، بے ثباتی میں بھی وجودِ بقا کا پہلو رکھتی ہے۔ منفرد فکر اور کمالاتِ انسانی کی لافنائیت کا یہی تصور قلندر باباؒ کی ذات اور احساسات کو عام ذہنوں اور عام تصورات سے بلند و بالا کرتا ہے۔ عظیم الشان محلات، عیش گاہوں کے اجڑے طاق، ٹوٹے در و دیوار — سرسری نگاہ سے دیکھنے والوں کے لئے محض روزمرہ کی داستان ہیں کہ دنیا کی ہر شے فانی ہے — ہر شے کی تعمیر میں تخریب اور ہر کمال کا مقدر زوال ہے۔ اس سے زیادہ نہ نگاہیں دیکھ سکتی ہیں اور نہ ذہن اس سے ماورا کوئی اور تصور قائم کر سکتا ہے۔ مگر شاعر کے نزدیک تخریب و زوال کا عمل محض عبرت کی داستان نہیں بلکہ اس کے تخلیقی ذہن اور گہرائیوں میں حقیقت تلاش کرنے والی نگاہوں کے سامنے محلات، عیش گاہوں کے ٹوٹے طاق اور در و دیوار کے ذرّوں میں وہ عظیم الشان عمارتیں ایک بار پھر پوری آب و تاب سے مکمل اور منور نظر آتی ہیں جن سے شاعر کی حسین یادیں وابستہ ہیں۔

بے ثباتی اور ٹوٹ پھوٹ کے عمل میں شاعر ان مقامات کی تصویر بھی دیکھتا ہے جن میں چند لمحے گزار کر یا جن محفلوں میں شریک ہو کر اس نے رودادِ اول بیان کی تھی اور جن اشعار نے اس کی زندگی میں ہی قبولیتِ عام حاصل کر لی تھی۔ اب اگرچہ وہ در و دیوار اور محفلیں، خوبیاں اور رعنائیاں کھو کر داستانِ پارینہ بن گئی ہیں مگر شاعر کا کلام اور ان محفلوں کی یاد ابھی تک محفوظ ہے۔ اس کی گواہی بھی شکستہ در و دیوار کے ذرّات دے رہے ہیں۔ امتدادِ زمانہ سے مٹی کا ڈھیر مٹی میں مل گیا مگر رودادِ اول جو مادیت اور زمان و مکان سے ماورا ہے — ابھی تک دل کی دھڑکن بنی ہوئی ہے۔

آج کی بات

''جس نے مقداروں کے ساتھ تخلیق کیا اور ان مقداروں کی ہدایت بخشی۔'' (الاعلیٰ:۲۔۳)

مخلوقات کی رفتار مخصوص ہونے کے ساتھ ایک دوسرے سے منسلک ہے۔ رفتار کا ایک رخ انفرادی اور دوسرا اجتماعی ہے۔ مثلاً چاند اور سورج کی مقداریں الگ ہیں لیکن ان کے ظاہر ہونے اور چھپنے کا وقت زمین سے قریب ہونے اور دوری کی وجہ سے ہے۔ زمین، چاند اور سورج منفرد رفتار کے باوجود باطنی رخ میں اشتراک رکھتے ہیں۔ اشتراک ایسی chain ہے جو ابتدا سے انتہا تک ہے۔ زمین ــــ چاند اور سورج میں مطابقت کے ساتھ اپنے مدار کے گرد بھی مخصوص رفتار سے گردش کر رہی ہے۔ علاوہ ازیں زمین ان سب چیزوں کی رفتار سے بھی ہم آہنگ ہے جو اس کے اوپر اور اندر ہیں۔ ہر شے کی انفرادی اور اجتماعی رفتار بیک وقت جاری ہے اور اس میں ذرّہ برابر فرق نہیں ہوتا۔

• • ——————— • •

زندگی ایک رخ میں نقش و نگار اور دوسرے رخ میں رفتار پر قائم ہے۔ رفتار کا تعلق وقت اور وقت کا شے کی سکت سے ہے۔ شے یک مشت ظاہر ہو سکتی ہے اور مرحلہ وار بھی۔ مادی خول میں اتنی سکت نہیں کہ یک مشت دباؤ برداشت کرے لہٰذا قدرت نے رفتار میں درجہ بندی رکھی ہے۔

ہر شے رفتار کی پابند ہے۔ پھل فروٹ موسم کی مناسبت سے مخصوص رفتار کے تحت بڑھتے اور پکتے ہیں۔ پھلوں کو پکانے میں فلکیاتی نظام سے ارضی نظام تک جتنے عناصر ہیں، سب متفرق مقداروں کے ساتھ حرکت میں ہیں۔ ہر تخلیق کی معین رفتار ہے اور اس رفتار میں رہتے ہوئے سب ایک دوسرے سے ربط میں ہیں۔ اس نکتہ پر تفکر سے صلاحیت کا انکشاف ہوتا ہے۔

چاند فلکیاتی مخلوق ہے اور فلک زمین سے الگ اسپیس ہے۔ فلک پر تخلیق زمینی اسپیس

سے آزاد مگر ایک حد تک پابند ہے ورنہ مخلوقات کو زمین سے چاند ستاروں کا ''عکس'' نظر نہیں آئے گا۔ مٹھاس پیدا کرنے کے لئے چاند کی کرنیں فلکی رفتار کے مطابق پھلوں کو مہیا ہوں تو پھل توانائی کی تاب نہ لاتے ہوئے پھٹ جائیں گے کیوں کہ توانائی شے کی ساخت اور رفتار کے مطابق فراہم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پھلوں کی نشو ونما کا وقت اور ذائقہ مختلف ہے۔

تخلیقی نظام کا حسن ہے کہ انفرادیت کے ساتھ اجتماعیت برقرار ہے۔

• • ———————— • •

سورہ رعد میں کائناتی ایکویشن کی تفہیم پڑھیے۔

(1-2) ''ال م ر۔ یہ کتاب کی آیات ہیں۔ اور جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے، حق ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔ اللہ وہ ہے جس نے ستونوں کے بغیر آسمان جیسا کہ تم دیکھتے ہو، اونچے بنائے۔ پھر عرش پر جا ٹھہرا۔ اور سورج اور چاند کو کام میں لگا دیا۔ ہر ایک معین میعاد تک گردش کر رہا ہے۔ وہی تدبیر سے امر کرتا ہے اور اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ تم اپنے پروردگار سے ملاقات کا یقین کرو۔'' (الرعد: ۱۔۲)

ان آیات میں رفتار اور کشش کا قانون بیان ہوا ہے۔ رفتار توانائی میں دباؤ کی مقدار ہے۔ قرآن کریم میں مقداروں کا صراحت سے بیان ہے لیکن غور کرنے والے لوگ کم ہیں۔

آسمان تناسب میں قائم اور حرکت میں ہے اور زمین بھی۔ دونوں کے اپنے مدار میں رہنے کی وجہ مقداریں ہیں۔ مقداروں کی حدود طے ہونے سے کشش اور گریز کا عمل متحرک ہو جاتا ہے۔ گریز ایک مقدار کو دوسری مقدار سے دور رکھتا ہے اور کشش ایک جیسی مقداروں کو قریب لاتی ہے ___ نمک نمک سے رجوع کرتا ہے اور مٹھاس مٹھاس میں مل جاتی ہے۔ چپک چپک کی طرف آتی ہے اور دوری بخارات بن کر اڑ جاتی ہے۔

فرض کیجئے ___ سیب اور کیلے میں مٹھاس کی مقدار بالترتیب 10 اور 15 فی صد ہو تو غور طلب ہے کہ چاند کی کرنیں دونوں میں موجود ہیں۔ کیا ہم نہیں کہہ سکتے کہ چاند کی صفات

معلوم کرنے کے لئے چاند پر جانا ضروری نہیں ___ چاند خود مختلف شکل میں پھلوں میں، سمندر کے مدوجزر میں، آدمی اور دوسری مخلوقات کی طبیعت اور مزاج میں داخل ہے۔

سورج اور چاند معین مقداروں پر قائم ہیں۔ حدت اور ٹھنڈک دونوں کو ملنے والی لہروں میں ہے مگر چاند میں حدت کم اور ٹھنڈک زیادہ ہے۔ سورج کو ملنے والی لہروں میں حدت کی مقدار زیادہ اور ٹھنڈک کم ہے۔ اب پڑھئے ___ ان میں کشش اور گریز کس طرح قائم ہے۔

سورج میں زیادہ حدت اور چاند میں زیادہ ٹھنڈک سورج اور چاند کو ایک دوسرے سے دور رکھتی ہے ___ یہ گریز ہے۔ اس کے ساتھ ہی زیادہ حدت دوسرے رخ میں موجود کم حدت کو اپنی طرف کھینچتی ہے ___ یہ کشش ہے۔ اسی طرح زیادہ ٹھنڈک دوسرے رخ میں موجود کم ٹھنڈک کو اپنی طرف کھینچتی ہے ___ یہ بھی کشش ہے۔ مساوات یہ بنی۔

(+) حدت (+) ٹھنڈک = گریز   (+) حدت (-) حدت = کشش

(+) ٹھنڈک (-) ٹھنڈک = کشش

اللہ تعالیٰ نے ہر شے جوڑے جوڑے اور جوڑے دہرے تخلیق فرمائی ہے۔ اگر دوسرے دن میں کشش نہ ہو تو پہلا دن دوسرے دن میں داخل نہیں ہوتا۔ داخل ہونے کے بعد پہلا دن گریز ہو جاتا ہے۔ شے میں کشش اور گریز کی مقداریں برابر ہوتی ہیں کیوں کہ لہریں جتنی توانائی سے ایک دوسرے کی طرف رجوع کرتی ہیں، اتنی ہی مقدار میں توانائی کے ذریعے گریز کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چیزیں اپنے مقامات پر متحرک لیکن ٹھہری ہوئی نظر آتی ہیں۔

• • ——————— • •

3 ''اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور دریا پیدا کئے اور ہر طرح کے ثمرات کے جوڑے دہرے بنائے۔ وہی رات کو دن کا لباس پہناتا ہے۔ غور کرنے والوں کے لئے اس میں نشانیاں ہیں۔'' (الرعد: ۳)

زمین کی بنیادی صفت کشش ہے۔ خالق ارض وسما نے زمین کو پھیلانے، اور اس کی رفتار کو شعوری سکت سے مطابقت کے لئے زمین میں پہاڑ اور دریا تخلیق کر کے گریز قائم کیا ہے۔

پہاڑ مظاہرہ ہے کہ کس طرح ذرّہ میں خمیر پیدا ہوتا ہے اور ذرّہ پھول کر پہاڑ بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم دیکھتے ہو پہاڑ جمے ہوئے ہیں لیکن یہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہیں۔

ثمرات (وسائل) میں تمام مخلوقات شامل ہیں۔ ہر مخلوق جوڑے دہرے ہے۔ مثال رات اور دن ہے۔ دونوں کی رفتار انفرادی مگر بنیاد ایک ہونے کی وجہ سے رات دن میں داخل ہوتی ہے اور دن رات کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔

• • ——————— • •

زمین ایک ہے، قطعات مختلف ہیں۔ قطعات ڈائیاں ہیں۔ ڈائیاں الگ کرنے کے لئے مقداروں میں تناسب کا نظام ہے۔ ایک ہی چیز زیادہ اور ایک ہی چیز کم ہونے سے سب چیزیں ایک دوسرے سے الگ نظر آتی ہیں۔

(4) ''اور زمین میں کئی طرح کے قطعات ہیں۔ ایک دوسرے سے ملے ہوئے۔ اور انگور کے باغ اور کھیتی اور کھجور کے درخت۔ بعض کی بہت سی شاخیں ہوتی ہیں اور بعض کی اتنی نہیں ہوتیں۔ پانی سب کو ایک ملتا ہے اور ہم بعض کو بعض پر لذت میں فضیلت دیتے ہیں۔ اس میں سمجھنے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔'' (الرعد:۴)

مختلف قطعات کا ایک دوسرے سے ملنا ــــ انفرادی اور اجتماعی ربط کی ایکویشن ہے۔ مثال آبنائے جبلِ طارق (Strait of Gibraltar) ہے جہاں بحرِ اوقیانوس اور بحیرہ روم ساتھ بہتے ہیں لیکن ملتے نہیں۔ مشاہدہ ہے کہ بحری جہاز دونوں پانی کے درمیانی خط پر سے گزرتا ہے تو سفید پانی کے چھینٹے سفید میں اور سیاہ پانی کے چھینٹے سیاہ میں گرتے ہیں۔

''دو سمندروں کو اس نے چھوڑ دیا ہے کہ باہم مل جائیں پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔'' (الرحمٰن: ۱۹-۲۰)

اللہ حافظ

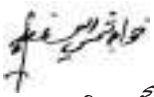

★ خواتین وحضرات قارئین! ''آج کی بات'' سے آپ کیا سمجھے ــــ؟

فقیر کی ڈاک

تفکر — ذہن کی دنیا میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔غور وفکر سے خیال کی گہرائیاں روشن ہوتی ہیں۔ گہرائی میں تخلیقی رموز کے خزینے ہیں جن تک رسائی — عرفان نفس اور معرفت الٰہی ہے۔ ''فقیر کی ڈاک'' اذہان کی آبیاری ہے جس میں مرشد کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب ذہن کی پرتوں کو کھول کر لاشعور کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

محترم مرشد کریم — السلام علیکم،

الحمدللہ — اللہ کی توفیق کے ساتھ اسباق اور مشقیں جاری ہیں۔رات سونے سے پہلے شمع بینی کی مشق کرتا ہوں اور اس کے بعد روضۂ رسولؐ کے تصور کے ساتھ 313 مرتبہ درودِ خضری کے ورد کی ادائیگی ہے۔اس سے پہلے کتاب محمد رسول اللہؐ کا مطالعہ بھی شامل ہے۔صبح نماز فجر کی ادائیگی کے بعد تصورِ شیخ کا مراقبہ جاری ہے۔کوشش ہوتی ہے کہ اسباق کے دوران ذہن حاضر اور ذکر میں رہے۔البتہ سانس کی مشق سے مطمئن نہیں ہوں۔سانس توجہ اور آہستگی سے لیتا اور خارج کرتا ہوں، اس کے باوجود سانس میں گہرائی نہیں ہے۔لگتا ہے پھیپھڑے تنگ اور کم زور ہیں۔راہ نمائی کی درخواست ہے۔

نیازمند۔ مبارک الٰہی (اسلام آباد)

برادر بجان برابر — اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے اور زندگی کے لمحات کو مبارک ومقبول فرمائے۔

آپ کی دل نواز تحریر میں نے پڑھی۔وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ،

آپ نے سلسلہ کے اسباق کے بارے میں تفصیل لکھی ہے۔نہایت مبارک بات ہے کہ وقت کی پابندی کے ساتھ اسباق اور مشق جاری ہے۔

عزیز بھائی! اللہ کی ہر تخلیق حواس کے ساتھ زندگی گزارتی ہے۔زندگی کے دورخ متعین ہیں۔

★ ایک رخ میں الوژن ہے، ٹوٹ پھوٹ ہے، یقین کی لہریں منتشر ہیں۔ایسی صورت میں کوئی بھی کام، کوئی بھی تحریر یقینی یا ہم جو چاہ رہے ہیں نتیجہ اس کے مطابق نہیں ہوتا۔اگر خیالات کی تعمیل اور تکمیل میں شکست و

ریخت ہے تو یہ سارا عمل الوژن (فریب نظر) کہلائے گا۔

★ دوسرا رخ جس کے اوپر پردہ پڑا ہوا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے، وہ یقین اور ایمان ہے۔

فریب نظر، الوژن ــــ وہ عمل ہے جسے ثبات نہیں۔ اس کے لئے دو رخ حضور پاکؐ کی تعلیمات کے مطابق یقین اور بے یقینی ہیں۔ آپ نے اسباق کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے میں جدوجہد کرتا ہوں کہ ناغہ نہ ہو۔ لیکن عزیز دوست! اگر کسی عمل میں اور مسلسل عمل میں نتیجہ منفی ہو یعنی نتیجہ مرتب ہوتا ہے اور فوراً تیاری شروع ہو جاتی ہے اور جب خیالات کی تکمیل ہوتی ہے تو وہ چیز نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے البتہ اثرات ضرور مرتب ہوتے ہیں۔ اور اس سارے عمل کی کسوٹی پیغمبران کرام اور خاتم النبیین حضور پاکؐ کی تعلیمات کے مطابق ہے۔

ہم اسکول میں پڑھتے ہیں۔ ہر سال کلاس میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ پہلی کلاس، دوسری کلاس، میٹرک، بی اے، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی ــــ یہ سب مراتب ہیں جو الوژن کی بیس (بنیاد) نظر آتے ہیں۔ غور کریں گے تو انشاءاللہ انکشاف ہوگا اور اس انکشاف میں مثبت اور منفی دونوں خیالات مظہر بن جائیں گے۔

اللہ کے معاملات میں یقین کارفرما ہے۔ اللہ کو پہچاننا، تسلیم کرنا اور قرآن میں بیان کردہ قانون کو سمجھنا صراط مستقیم ہے۔ جس طرح نرسری کی کلاس سے آدمی ایم اے یا پی ایچ ڈی تک پہنچ جاتا ہے اسی طرح صلوٰۃ ایسا عمل ہے کہ جس سے ذات باری تعالیٰ اور اس کے محبوبؐ کا یقین حاصل ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں دو کیٹگری بیان ہوئی ہیں۔

> ''یہ بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ ان سے کہو تم ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہو کہ اسلام لائے ہو۔ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا'' (الحجرٰت :۱۴)

نماز کے ارکان پر غور کیجئے۔ زندگی کی حرکات وسکنات میں ذہن اللہ کی طرف متوجہ رہے۔ یہ سب حرکات نماز میں ہیں۔ نماز کے ارکان پر غور کریں تو بات کھل کر سامنے آجائے گی۔ لیکن یہ بھی سوچنا ہے کہ ہم دفتر میں آٹھ گھنٹے بیٹھتے ہیں۔ خیالات میں انتشار ہو جائے تو ڈیوٹی پوری نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ پڑھنا بالکل الگ بات ہے لیکن تعلیم میں تفکر کرنا الگ بات ہے۔

''سینہ'' فراخ نہ ہونے کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے، اس کے بارے میں تفکر کیجئے، انشاءاللہ بات کھل جائے گی۔

دعاگو، عظیمی (15 جولائی 2019ء)

نامے میرے نام

کرم فرما خواتین وحضرات نے ''ماہنامہ قلندرشعور'' کو دل کی گہرائیوں سے نہ صرف پسند کیا ہے بلکہ قبول فرما کر روپ بہروپ کو دلہن کا روپ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قارئین کی خدمت کی توفیق دیں۔ رابطہ کے قدیم وجدید وسائل کے ذریعہ موصول ہونے والے خطوط میں سے منتخب خطوط شائع کئے جارہے ہیں۔

جولائی 2019ء کے ''آج کی بات'' پر منتخب تفکر پیش خدمت ہے۔

اراکین مراقبہ ہال (واہ کینٹ): خط کشیدہ جملے ''نیوٹرل ایسا نقطہ ہے جہاں منفی اور مثبت چارج ایک ہیں'' پر اجتماعی تفکر کا خلاصہ یہ ہے۔ رات لاشعور اور دن شعور ہے۔ لاشعور میں روشنی منفی درجہ پر رہتی ہے اور دن میں مثبت درجہ میں داخل ہوجاتی ہے۔ مثبت درجہ میں حواس تقسیم ہوتے ہیں۔ نیند میں بھی انسان کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے لیکن وہ جو کچھ کرتا ہے اس سے وہ واقف نہیں ہوتا۔ بیداری کی حالت میں ہم جس چیز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس کو یاد رکھتے ہیں اور جس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، بھول جاتے ہیں۔ نیند کی دنیا میں ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جب شعور اور لاشعور یا مثبت اور منفی چارج ایک ہوجاتے ہیں۔ مراقبہ میں اسی کیفیت کو حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں شعور اور لاشعور متوازی ہوجاتے ہیں اور انسان — نیند میں ''بیدار'' ہوتا ہے۔

محمد طاہر (چنیوٹ): ''آج کی بات'' میں تجربہ دیا گیا ہے۔ تجربہ کے دوران زمین کی طرف نظر جمائی۔ جب ذہن خود پر سے ہٹا تو زمین کی سمتیں غائب ہوگئیں لیکن تجربہ کے بعد زوردار چکر آیا اور دماغ کے اندر ایک روشن نقطہ کا احساس ہوا۔

عظیمیہ روحانی لائبریری (میانوالی): ''آج کی بات'' پر کُل 17 افراد نے تفکر کیا۔ نکات پیش خدمت ہیں۔

۱۔ نسمہ کی روشنی ہر وقت زمین کو فیڈ کرتی ہے، اس روشنی کا نام لیل یعنی لاشعور کے حواس ہیں۔

۲۔ یہ روشنی میگنیٹک لائنز آف فورس کی صورت میں زمین کے پولز سے خارج ہوکر سورج پر پڑتی ہے۔ سورج ان شعاعوں کو دھوپ میں تبدیل کرکے زمین پر منعکس کرتا ہے۔ دھوپ کی ان شعاعوں کا نام نہار یعنی دن کے حواس ہیں۔

۳۔ لیل کے حواس میں روشنی منفی درجہ اور نہار کے حواس میں مثبت درجہ میں ہوتی ہے۔

۴۔اللہ نے ہر چیز معین مقداروں میں بنائی۔مثبت اور منفی روشنی مقداریں ہیں۔ردّ و بدل کے عمل میں جب یہ مقداریں ایک ہوتی ہیں تو منفی اور مثبت مغلوب ہوکر ''نیوٹرل'' ہوجاتے ہیں۔جس طرح الیکٹران پر منفی اور پروٹان پر مثبت چارج ہوتا ہے جب کہ نیوٹران میں یہ دونوں چارج موجود ہوتے ہیں۔نیوٹران میں دونوں کی مقداریں الگ کرنے سے الیکٹران اور پروٹان بن جاتے ہیں۔

۵۔شعوری زندگی کا لاشعوری زندگی میں داخل ہونا حیات وممات ہے۔

۶۔مٹھاس سے شعوری اور نمک سے لاشعوری حواس بنتے ہیں۔ان کی کمی یا زیادتی سے شعور متوازن نہیں رہتا۔

۷۔روحانی استاد اپنے شاگرد کے اندر نمک اور مٹھاس کی مقداروں کو متوازن رکھتا ہے۔جب شاگرد استاد کی ہدایات پر ثابت قدمی سے عمل کرتا ہے تو شاگرد کے مثبت اور منفی چارج مغلوب ہوکر نیوٹرل ہوجاتے ہیں۔اسے قلندر شعور کہتے ہیں۔۔۔بندہ اپنی نفی کر کے کیئر آف اللہ سوچتا ہے۔

صائمہ نصیر (فیصل آباد): ''آج کی بات'' ہمیشہ کی طرح بہت سی سوچوں کے دروازے کھول دیتی ہے۔جب تک اپنی اصل سے واقف نہیں ہوں گے،سمتوں میں رہیں گے۔تصور شیخ میں یک سوئی سے ایک لمحہ ایسا آتا ہے کہ شیخ کا تصور مرید پر محیط ہوجاتا ہے۔

محتشم رفیق (ساہیوال): کھلے میدان میں کھڑے ہوکر زمین کو دیکھا۔ابتدا میں ڈائی مینشن حذف ہونے سے سر چکرا گیا۔مشق میں ہر دفعہ یک سوئی ہوتے ہی چکر آئے۔

عدنان نذیر (اٹک): حواس کی نشان دہی جوڑے جوڑے کی صورت میں کی گئی ہے جیسے دن رات،شعور لاشعور، منفی مثبت،مٹھاس نمک،ظاہر باطن وغیرہ۔ہر جوڑے میں ایک رخ کا تعلق مادیت اور مفروضہ سے ہے اور دوسرا رخ غیر جانب دار ہے۔جب ذہن متعدد خیالات سے ہٹ کر ایک نقطہ یا خیال پر یک سو ہوتا ہے تو باقی تمام خیالات بے معنی ہوجاتے ہیں۔تغیر والے لباس کی نفی سے مفروضہ حواس کی گرفت ختم ہوجاتی ہے۔ذہن لاشعور میں داخل ہوتا ہے اور لاشعور نور ہے۔جس میں مثبت یا منفی ڈائی مینشن کے فارمولے ہیں۔

شاہدہ رحیم (ملتان): ''مٹھاس گریویٹی کو بیلنس رکھتا ہے اور نمک سے گریویٹی کم ہوتی ہے۔'' مٹھاس تو ذائقہ ہے۔ذائقہ کا گریویٹی سے کیا تعلق ہے؟ نمک بھی ذائقہ ہے۔روحانیت میں ذائقہ سے کیا مراد ہے۔۔۔؟

سلیمان شاہ (کراچی): حواس کی توجیہ پڑھ کر میرا دل چاہا کہ اگر میں آنکھیں بند کر کے اندر کی آواز سنا کروں اور اس آواز کو دیکھنے کی کوشش کروں تو مجھے آواز میں ہی سب کچھ نظر آجائے گا۔

مضامین پر موصول ہونے والے تبصرے اور تفکر میں سے چند پیش خدمت ہیں۔

عمر اعظم (سوات): پیراسائیکالوجی کا کالم شروع ہونے پر بے حد خوشی ہے اور ہم شدت سے اس کے منتظر ہیں۔ مسائل کا حل شروع کرنے سے پہلے علم کی تفہیم اچھا قدم ہے۔ اب تک جو اقساط شائع کی گئی ہیں، اسے بعد میں کتابچہ کی صورت میں شائع کیا جائے۔

خ۔س (کراچی): پیراسائیکالوجی (مسائل کا حل) کے مضمون میں آئینہ کی مشق کی توجیہ پوچھی گئی تھی۔ لڑکی کو چالیس دن آنکھیں بند کر کے آئینہ کے سامنے یہ کہنے کی مشق دی گئی کہ ''میری ناک موٹی اور بھدی نہیں ہے، چہرہ کی مناسبت سے ٹھیک ہے''۔ غور کرنے سے سمجھ میں آیا کہ باہر کی آنکھ بند ہونے سے نظر اندر کھلتی ہے اور تصورات اندر بنتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آنکھ بند کر کے الفاظ دہرانے سے آواز میں موجود اطلاع کا نقش اندر میں آئینہ پر پڑا اور ارادہ میں تصورات منعکس ہو گئے۔ آنکھ کھولنے سے بندہ نے وہی دیکھا جس کا نقش آئینہ میں بنا۔ اسی طرح خواجہ غریب نوازؒ اور سادھو کا واقعہ بتاتا ہے کہ ہر شخص کے اندر آئینہ ہے جس میں وہ عکس دیکھ کر چیزوں کو باہر گمان کرتا ہے۔

★ **کوشش اچھی ہے لیکن مفہوم واضح نہیں ہوا۔**

فرزانہ بانو (کراچی): ظاہری آنکھ سے دیکھنے سے حواس تقسیم ہوتے ہیں۔ بند آنکھوں سے مشق کرنے سے حواس تقسیم نہیں ہوتے۔ دراصل یہ باطن میں دیکھنے کی مشق ہے جہاں حواس بنتے اور تخلیق ہوتے ہیں۔ توجہ الفاظ پر مرکوز ہونے سے خیال تصور اور تصور احساس میں ڈھلتا ہے، احساس مظہر بن جاتا ہے۔

وجیہہ مشتاق (بہاولپور): ہماری ایک سہیلی کالج آئی تو آج اس کے بیگ میں رسالہ تھا۔ اس نے فری پیریڈ میں رسالہ نکال کر ہمارے سامنے رکھا۔ سب سے پہلے رسالہ کے نام اور اس پر تحریر نے بہت متاثر کیا۔ میں نے سوچا کہ قلندر شعور کیا ہوتا ہے اور روح کے عرفان کے ذریعے اس کا تعارف کیسے حاصل ہوتا ہے۔ پھر سرورق پر پرندوں کو دائروں میں بیٹھا دیکھا تو میں نے بے ساختہ کہا، منطق الطیر۔ دوست نے بتایا کہ منطق الطیر بھی اس رسالہ میں شائع ہو چکی ہے۔ رسالہ کھولا تو اندر دنیا ہی اور ہے۔ ''ماہنامہ قلندر شعور'' میں شروع سے آخر تک ہر موضوع منفرد اور عمیق ہے۔ میں رسالہ گھر لے آئی۔ اس علم سے ناواقفیت کی وجہ سے بعض باتیں میرے لئے مشکل ہیں۔ مگر جس طرح کائنات کی روحانی سائنس بیان کی گئی ہے، اس نے دل میں شوق پیدا کر دیا ہے کہ میں اس رسالہ کو باقاعدگی سے پڑھوں۔

دل پذیر (لاہور): سرورق دیکھ کر سوال ذہن میں آیا کہ کیا پرندے بھی قید و بند سے تحفظ اور آزادی چاہتے ہیں؟

آدمی کے مقابلہ میں پرندے آزاد ہیں۔ پھر پرندے کس قید سے آزادی چاہتے ہیں؟ ہم آدمی مل بیٹھ کر ایسی باتیں کیوں نہیں کرتے؟ یہاں تو ہر پرندہ بے تاب ہے۔ کچھ آنکھیں کھولے گہرے تفکر میں ہیں، کچھ آنکھیں بند کر کے مراقبہ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور باقی اندر باہر کے فرق سے گھبرا گئے ہیں، وہ بھی امان میں آنا چاہتے ہیں۔ خوب صورت نظارہ نے مجھے بے چین کر دیا۔

فائزہ قمر (کراچی): حامد ابراہیم صاحب کی تحریریں بہت پسند ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ ذرّات پر مضمون لکھیں۔

سلجوق (نوشہرہ): ''بچے نے گٹھلی میں کیا دیکھا'' لکھ کر احمد نواز صاحب نے متوجہ کیا ہے کہ جس چیز کا خیال آتا ہے ہم دراصل اس کے ماضی، حال اور مستقبل کی پوری تصویر اس خیال میں دیکھ سکتے ہیں۔

محمد حمزہ (کراچی): کہانی وہ اچھی ہے جس میں گہرائی، معلومات اور ہلکی پھلکی رنگ و رعنائی ہو۔ ''پورب کے ہم زاد'' کے پلاٹ کی اٹھان بتاتی ہے کہ اچھی کہانی کے لوازمات اس میں موجود ہیں۔ ''ماہنامہ قلندر شعور'' کا امتیاز ہے کہ ادب اور پاکیزگی کا خیال رکھا جاتا ہے۔ پڑھنے والے کا ذہن بھی صاف ہو جاتا ہے۔ مثلاً میرے دوست کہتے ہیں کہ میری زبان بدل گئی ہے۔ ان کے بقول میں عام بول چال سے ہٹ کر اب نفیس زبان بولتا ہوں۔ بہت شوق سے شروع سے آخر تک ہر مضمون غور سے پڑھتا ہوں، لفظ ذہن پر نقش ہو رہے ہیں۔ نامے میرے نام میں لوگوں کا تفکر متاثر کرتا ہے۔ پہلی بار خط لکھا ہے، امید ہے شائع ہوگا۔

★ ——★ ——★

شبانہ عرشی (پرنسپل، عظیمی پبلک ہائر سیکنڈری اسکول۔ کراچی): الحمدللہ! ہم سب کے لئے خوشی کا موقع ہے کہ عظیمی پبلک ہائر سیکنڈری اسکول کی ہونہار طالبہ وزیمہ نگین دختر ظفر اقبال نے میٹرک بورڈ کے تحت ہونے والے امتحان 2019ء میں 92 فی صد نمبر لے کر نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ وزیمہ نگین سائنس کی طالبہ ہیں اور انہوں نے ٹیوشن لئے بغیر عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

★ ماشاءاللہ! طالبہ وزیمہ نگین، ان کے والدین اور اساتذہ کو ادارہ ''ماہنامہ قلندر شعور'' کی جانب سے بہت مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ مزید کامیابی عطا فرمائے۔ دعا ہے کہ اساتذہ اور والدین ایثار اور خلوص سے نسلوں کی تربیت کریں تاکہ تعمیری معاشرہ قائم ہو، آمین۔

ا ب ج د

بادشاہ اگر اپنے منصب کو چھوڑ کر وزیر خزانہ بن جائے تو خزانہ کا وزیر ہونے کے باوجود بادشاہ سے وزیر بننا — تنزل ہے۔

شے کا عدم سے وجود میں آنا صلاحیت ہے۔ کسی وصف پر متوجہ ہونے سے دو رموز آشکار ہوتے ہیں۔ پہلا رمز توجہ مبذول کرنے والی ہستی اور دوسرا نگاہ کی وسعت ہے۔ نگاہ شے میں داخل ہونے سے خیال میں موجود روشنی پھیلتی ہے اور رنگ ظاہر ہوتے ہیں۔ رنگوں کا ظاہر ہونا — روشنی میں مغلوب خدوخال کا ادراک ہے۔ ادراک کے معنی تصویر دیکھ لینے کے ساتھ تصویر سے کسی حد تک واقف ہونا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کو درجات کے مطابق اشیا کی کنہ تک پہنچنے کی صلاحیت عطا کی ہے اور مخلوقات میں انسان کو احسن تقویم فرمایا ہے۔ انسان کو حاصل علم فرشتوں اور جنات کو حاصل نہیں۔ یہ نظام تکوین کا علم ہے جس کے تحت انسان کون و مکان میں نظامت کے فرائض سنبھالتا ہے۔

فی الارض خلیفہ انسان کے بعد کائنات میں فرشتوں اور جنات کا کردار اہم ہے۔ فرشتے نوری مخلوق ہیں، جنات نار سے بنے ہیں اور دونوں کی صفات منفرد ہیں۔ فرشتے اور جنات آدمی کی دنیا میں آتے جاتے رہتے ہیں لیکن آدمی ان کی دنیا میں نہیں جا سکتا جب تک کہ وہ احسن تقویم کے درجہ میں داخل نہ ہو جائے۔ اس مقام تک پہنچنے والوں کی تعداد لاکھوں میں ایک ہے۔

کیا ہم نے سوچا ہے کہ نوع آدم کے لاکھوں افراد میں سے ایک فرد اس مرتبہ پر کیسے پہنچتا ہے اور باقی کیوں پیچھے رہ جاتے ہیں؟

پیدائش کے بعد اوائل عمری میں بچہ بیک وقت مختلف رجحانات کا اظہار کرتا ہے جو نوع آدم کے اندر موجود صلاحیت کی نشان دہی ہے۔ تجسس، تحقیق، تفکر، طب، انجینئرنگ، مصوری، مجسمہ سازی، موسیقی، ارضیات، تعمیرات، ایتھلیٹکس، طبیعیات، نباتات، کیمیا — بچہ کے طرز عمل میں کسی بھی شعبہ کے لئے درکار صفات کی صلاحیت موجود ہے۔

تحقیق کی ابتدا تفکر سے ہوتی ہے۔ آواز سن کر بچہ تلاش کرتا ہے کہ آواز کہاں سے آئی اور آواز دینے

والا کون ہے۔ وہ کسی چیز کو سوچے سمجھے بغیر استعمال کے بجائے پہلے الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے، کھولنے کی کوشش کرتا ہے، پھر زمین پر مارتا ہے، آواز آتی ہے تو ایک بار پھر اس چیز کو دیکھ کر کھیلنا شروع کر دیتا ہے۔

بچہ مٹی میں بیٹھتا ہے تو اس بات کو نظر انداز نہیں کرتا کہ وہ بیٹھا کس پر ہے، مٹی ہاتھ میں لے کر ذرّات مسلتا ہے، ہتھیلی میں محسوس کرتا ہے، مٹی پھسل کر زمین پر گرتی ہے تو پھر اٹھاتا ہے اور اس بار منہ میں ڈالتا ہے۔ اس کا تجسس مٹی کو مختلف طریقوں سے جانچتا ہے اور تجربہ کی انتہا پر وہ اسے کھا کر ذائقہ چکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ آخر مٹی کیا ہے۔ تھوڑا بڑا ہو تو مٹی سے گھر بناتا ہے۔ مٹی کو کھودنا یا کھوجنا، بچے کے اندر موجود زمین سے متعلق علم کا اظہار ہے۔

بچہ کی سرگرمیوں کا آغاز تجسس اور تفکر سے ہوتا ہے۔ وہ سوالات پوچھتا ہے، پلک جھپکائے بغیر دیکھتا ہے، ذائقہ کے ذریعے تعارف حاصل کرتا ہے، رنگوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے، ہاتھ میں رنگ یا پنسل دیں — کاغذ، دیوار یا زمین پر لکیریں بنانا شروع کر دیتا ہے، جو چیز ہاتھ میں آتی ہے، سب سے پہلے کھولتا ہے پھر جوڑتا ہے، چیزوں کی ساخت سمجھنا چاہتا ہے، کھیل کود کا شوقین ہوتا ہے، بسکٹ پانی میں ڈال کر گلاس میں موجود پانی زمین پر انڈیل دیتا ہے، معصوم زبان میں باتیں کر کے اندر موجود بلاغت کا اظہار کرتا ہے اور بعض اوقات آواز کو کھینچ کر سُر تال بھی ظاہر کرتا ہے۔ یہ سب باتیں دنیا میں رائج جدید و قدیم علوم کی عکاسی کرتی ہیں۔

ہر فرد کے اندر وہ تمام صلاحیتیں ہیں جن سے کوئی شے تخلیق ہوتی ہے اور نظم و نسق کا نظام چلتا ہے مگر جب ماں باپ اور رشتہ دار پوچھتے ہیں کہ بیٹا! بڑے ہو کر کیا بنو گے تو یہاں سے لامحدود ذہن — محدود ہو جاتا ہے۔

چھوٹے بچہ کو گنتی نہیں آتی، وہ مادی اعداد و شمار سے آزاد ہوتا ہے۔ نرسری میں A بنانے یا ون ٹو لکھنے میں مشکل درپیش ہوتی ہے کیوں کہ وہ جس عالم سے آیا ہے وہاں لکیریں مغلوب ہیں اور روشنی غالب ہے۔ اگرچہ بچہ کے اندر اعداد و شمار کا علم ہے — وہ اس دنیا میں انفرادی پہچان کے ساتھ آیا ہے لیکن ابھی ذہن پر مادیت کا رنگ پوری طرح غالب نہیں ہوا اس لئے اسے گنتی نہیں آتی۔

مادی علم مثلث سے شروع ہوتا ہے۔ مثلث کے معنی چیزوں کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنا ہے۔ لکھائی سکھانے کے لئے ابتدا میں کاپی دی جاتی ہے جس میں سادہ کاغذ پر متعدد خانے ہوتے ہیں۔

اسکول میں بچہ کا ابتدائی سبق خانوں میں تکونی شکل میں لکیریں بنانا ہے۔ یہاں سے ذہن میں باضابطہ طور پر دائرہ مغلوب اور مثلث غالب ہوتا ہے۔ جب تکون پر گرفت ہو جاتی ہے اور لکیریں سیدھ میں بنتی ہیں تو

A	B	C	D	E	F
ث	ٹ	ت	پ	ب	ا
1	2	3	4	5	6

مثلث کا باقاعدہ نصابی کورس شروع ہوتا ہے جس کو کلاس ون، ٹو، تھری وغیرہ کہتے ہیں۔ اور ایک وقت کے بعد وہ بچہ جو لامحدود صفاتی علوم کے ساتھ پیدا ہوا تھا، فکشن علوم تک محدود ہو جاتا ہے۔

دنیا کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اکتسابی علم کا حصول ضروری ہے مگر اس کے لئے اختیار کئے گئے طریقِ کار سے وسیع ذہن کا محدود ہونا— قابل غور ہے۔ بادشاہ اگر اپنے منصب کو چھوڑ کر وزیر خزانہ بن جائے تو خزانہ کا وزیر ہونے کے باوجود بادشاہ سے وزیر بننا— تنزل ہے۔

کائنات میں جتنے علوم ہیں، ہر پیدا ہونے والے فرد کے اندر موجود ہیں۔ خالق کائنات نے کُن فرمایا تو آواز ہر فرد کے باطن میں داخل ہوئی۔ آواز داخل ہونے سے کُن میں موجود تصویریں منتقل ہوئیں۔ الست بربکم (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟) کے سوال سے ریکارڈ متحرک ہوا اور فرد نے خود کو، کائنات اور خالق کائنات کو دیکھا۔ ازل میں منتقل کیا گیا تصویری ریکارڈ ہر فرد کی راہ نمائی کرتا ہے کہ وہ کب، کیسے اور کیا عمل اختیار کرے۔

ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ نے اس بات کو مصور کی مثال سے سمجھایا ہے جس کا مفہوم ہے کہ مصور تصویر بناتا ہے تو ذہن میں پہلے سے موجود تصویر کا عکس بار بار راہ نمائی کرتا ہے کہ ہر عضو کی ساخت کے لئے پنسل کے خاص وضع کے نشانات استعمال ہوں گے۔ ضروری نہیں کہ جو تصویر استاد کے ذہن میں ہو، وہی شاگرد کے ذہن میں بھی آئے البتہ کبوتر کبوتر اور چڑیا چڑیا ہے۔ رنگ اور قد کاٹھ مختلف ہوسکتا ہے لیکن کبوتر اور چڑیا کے بنیادی نقوش تبدیل نہیں ہوتے۔ بنیادی علم میں اشتراک کی مناسبت سے استاد شاگرد کی راہ نمائی کرتا ہے۔ وہ تصویر کا عکس شاگرد کے ذہن میں منتقل نہیں کرتا کیوں کہ تصویر شاگرد کے باطن میں پہلے سے موجود ہے۔ دنیا میں تمام علوم کی یہی مثال ہے۔

انفرادی پہچان کے ساتھ بچہ جس نوع سے تعلق رکھتا ہے اس میں اشرف المخلوقات ہونے کی صلاحیت ہے۔

ہم کسی مخصوص علم میں کتنی کام یابی کیوں نہ حاصل کرلیں ایک روز یہاں سے جانا ہے۔ وہاں وہ علم کام آئے گا جس کے ساتھ اس دنیا میں بھیجا گیا تھا یعنی تخلیق کائنات کے فارمولوں کا علم! جن لوگوں کو یہ علم منتقل ہوجاتا ہے، دنیا کی ہر شے ان کے آگے جھک جاتی ہے۔ تخلیقی فارمولوں کا علم جن ہستیوں کو منتقل ہوتا ہے، وہ زمان سے واقف ہوجاتی ہیں، اور مکان ان کے تابع ہوجاتا ہے۔

''اس نے زمین اور آسمان کی ساری چیزوں کو تمہارے لئے مسخر کردیا سب کچھ اپنے پاس سے۔ اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔'' (الجاثیہ:۱۳)

کائنات کے تخلیقی فارمولوں کے علم کی افزائش اس عمل سے ہوتی ہے جس کا ہر فرد بچپن میں مظاہرہ کرتا ہے یعنی مظاہر کائنات کو جاننے کی خواہش اور خواہش کو پورا کرنے کے لئے تفکر! خالق کائنات کا ارشاد ہے،

''بے شک آسمان اور زمین کی پیدائش اور دن اور رات کے آنے جانے میں نشانیاں ہیں اولی الالباب کے لئے جو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے زمین و آسمان کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں کہ اے پروردگار تو نے انہیں بے مقصد پیدا نہیں کیا۔'' (ال عمران:۱۹۰۔۱۹۱)

مظاہر کائنات کی طرف متوجہ ہونے کے لئے درکار عوامل بچے کے اندر موجود ہیں۔ بچہ مٹی میں کھیلے یا پانی میں، کاغذ پر رنگ بھرے یا ٹکڑوں کو جوڑ کر ریل گاڑی بنائے — اس کی ہر سرگرمی کی ابتدا تجسس سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ تحقیق یا تفکر کرتا ہے اور تفکر کو تجربہ کی بنیاد پر پرکھتا ہے۔ اگر ماں باپ بچہ میں تفکر کی نشوونما پر توجہ دیں تو باطن میں موجود ہر علم کی افزائش ہوتی ہے۔ ابدالِ حق فرماتے ہیں،

''نوع انسانی میں زندگی کی سرگرمیوں کے پیش نظر طبائع کی مختلف ساخت ہوتی ہیں، مثلاً ساخت الف ب پ چ وغیرہ وغیرہ۔ یہاں زیر بحث وہ ساخت ہے جو قدم قدم چلا کر عرفان کی منزل تک پہنچاتی ہے۔'' (لوح وقلم)

اپنے اندر اس صلاحیت سے متعارف ہوں جو آپ کو اللہ سے قریب کردے۔ آدمی جب وقت کی بیلٹ پر سے گزرتا ہے تو اس کا گزرنا فکشن بن جاتا ہے لیکن وقت آدمی کے اندر موجود رہتا ہے۔ اندر کی دنیا میں داخل ہوں اور افکار کی دنیا میں سفر کریں تو زندگی کی شبِ تاریک سحر ہوجائے گی۔

عاشق رسولؐ — علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں،

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

مسائل کا حل

''ماہنامہ قلندر شعور'' میں ''خواب کی تعبیر'' کے مقبول سلسلہ کے علاوہ پیرا سائیکالوجی طریقۂ علاج کے تحت مسائل کے حل کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ اگر آپ کسی مسئلہ کا حل دریافت کرنا چاہیں تو ادارہ کو خط لکھ سکتے ہیں۔ خط کے ساتھ ٹوکن منسلک ہونا ضروری ہے۔ ٹوکن جلد شائع کیا جائے گا، انشاءاللہ۔

پیرا سائیکالوجی سے متعلق گذشتہ اقساط کا خلاصہ پڑھئے:

خیال میں وہ سب موجود ہے جو کائنات میں ہے۔ کائنات کی ابتدا ارادہ سے ہوئی اور ارادہ کائنات میں خیال کی ابتدا ہے۔ آدمی ایجادات کے لئے پہلے سے موجود ''وسائل'' سے مدد لیتا ہے۔ وسائل کو محض مادی اشیا سے منسوب کیا جاتا ہے جب کہ کسی بھی کام کو انجام دینے کے لئے بنیادی وسیلہ **خ ی ال** ہے۔ سننا دیکھنا، سمجھنا بولنا، کھانا پینا، چلنا پھرنا، سونا جاگنا، لکھنا پڑھنا، غور کرنا — خیال کے تحت ہے۔ خیال پر عمل کو فرد جب اپنے ارادہ سے منسوب کرتا ہے تو مسائل شروع ہوتے ہیں۔ مسائل کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ذہن رک گیا ہے۔

زندگی تین معین دائروں میں گزرتی ہے۔ فزکس — وسائل کی دنیا ہے۔ فرد وسائل استعمال کرتے ہوئے جن تجربات سے گزرتا ہے وہ سائیکالوجی ہے۔ وسائل اور ان کی طرف متوجہ ہونے کا خیال جہاں سے آرہا ہے وہ علم پیرا سائیکالوجی ہے۔ شے کی طرف متوجہ ہونے سے شے کی خصوصیات منتقل ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس فرد خیال کے سورس، خیال کی تحریکات اور خیال کے نظام پر متوجہ ہو جائے تو ذہن شکوک وشبہات اور ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

اب آپ پڑھئے کہ توجہ کی مدد سے فرد طبیعیات میں رہتے ہوئے پیرا سائیکالوجی کے زون میں کیسے داخل ہو سکتا ہے۔

---

(4) مابعد النفسیات (پیرا سائیکالوجی) میں مریض کے ماحول اور نفسیات کا ادراک کر کے علاج کیا جاتا ہے کہ ذہن کہاں الجھ گیا ہے۔ چوں کہ ہر عمل کا تعلق خیال سے ہے لہٰذا فرد کی توجہ تبدیل کرنے سے مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔

فرد کو ذہنی طور پر مضبوط بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے سکھایا جائے کہ مایوسی یا ذہنی تناؤ سے توجہ کیسے تبدیل کریں۔ یعنی فرد کی نفسیات میں تصرف!

آدمی حالات وواقعات اور ماحول میں موجود چیزوں کو نفسیات کے مطابق دیکھتا ہے۔ کوئی فرد بڑی سے

بڑی بات کو نظر انداز اور کوئی چھوٹی بات کو مسئلہ بنا لیتا ہے۔فرق رویہ کا ہے جو ماحول سے بنتا ہے اور ماحول کی بنیاد طرز فکر ہے۔ یہی طرز فکر نفسیات ہے۔ نفسیات اور طبیعیات کی دنیا کو سمجھنے کے لئے مابعد النفسیات کا علم راہ نمائی کرتا ہے۔

علم مابعدالنفسیات انکشاف کرتا ہے کہ دنیا میں کسی عمل کی تکمیل خیال آئے بغیر نہیں ہوتی۔ روحانی علوم بتاتے ہیں کہ انسان تین پرت کا مجموعہ ہے۔

۱۔ صفات

۲۔ ذات

۳۔ مادی جسم

پرت کیا ہے ــــ؟ پیاز کی مثال سے سمجھیں۔

پیاز پرتوں کا مجموعہ ہے۔ پرتوں کو احتیاط سے الگ کریں، پیاز نظر نہیں آئے گا، میز پر ذرّات بکھرے ہوں گے۔ پیاز کہاں گیا ــــ؟

ذات اور صفات جاننے کی دو طرزیں ہیں۔

پانی سے پیاس بجھتی ہے، بجلی بنتی ہے، یہ زندگی کو برقرار رکھتا ہے اور تخلیقی عناصر میں بنیادی عنصر ہے۔ یہ پانی کی صفات ہیں۔ پانی بذات خود کیا ہے، اس سے واقف ہونے کے لئے ان مقداروں کا وقوف حاصل کرنا ہے جن سے پانی بنتا ہے۔ کسی چیز کا وصف معلوم کر لینا شعور کے دائرہ کار میں ہے لیکن اس کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے شعور سے ماورا ایک اور شعور ہے جسے لاشعور کہتے ہیں۔

پانی کی حقیقت کیا ہے یہ امر ان لوگوں پر منکشف ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نائب، پیغمبران کرام اور خاتم النبیین حضرت محمدؐ کے روحانی علوم کے وارث ہیں۔ ایسے بندے خلیفۃ الارض ہیں۔

ایک شخص کا نام زید ہے۔ زید ماضی میں خودغرض تھا لیکن اب لوگوں کا ہم درد ہے۔ ممکن ہے کہ مستقبل میں اس کی صفات میں مزید تبدیلی واقع ہو۔ سطحی شعور کی رائے زید کے بارے میں بدلتی رہے گی۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ زید خودغرض تھا تو بھی زید تھا اور جب نرم دل بنا تب بھی زید رہا، اسے اچھے اور برے کی سند ماحول نے دی۔

روحانی علوم سے واقف ہستیوں کے لیے زید کھلی کتاب ہے کیوں کہ وہ ظاہر میں نہیں اللہ کی دی ہوئی بصارت سے باطن سے واقف ہوتے ہیں۔

صفات دراصل ذات کا تعارف ہیں۔ روحانی انسان صفات کے ذریعے ذات مطلق کی تلاش میں رہتا ہے۔ خالق کائنات اللہ نے آسمانی کتابوں میں صفات کو اپنی نشانیاں قرار دیا ہے کہ بندہ صفات کے ذریعے ذات کا عرفان حاصل کرے۔

پیاز کی پرتیں پیاز کی صفات ہیں۔ ان پرتوں میں ذات تک پہنچنے کی خصوصیات ہیں۔ پیاز کے پرت سے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ پیاز ہے۔ اسی طرح پانی کے

قطرہ میں سمندر کی مقداریں ہیں۔ مٹی کے ذرّہ میں پہاڑ ریکارڈ ہے — بات پرت، قطرہ اور ذرّہ کے اندر دیکھنے اور تفکر کرنے کی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو دین فطرت پر پیدا کیا ہے، ماں باپ کی تربیت اور ماحول اسے تعصّبات میں تقسیم کر دیتی ہے۔ دین فطرت یہ ہے کہ بندہ کو کامل یقین ہو کہ اسے پیدا کرنے، رزق دینے، کفالت اور تمام ضروریات پوری کرنے والی ذات صرف اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ وہ خود کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے۔ یہ نیوٹرل طرز فکر ہے۔

''جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہمارا اس بات پر یقین ہے کہ ہر شے اللہ کی طرف سے ہے۔''

(العنکبوت: ۶۹)

اس کے برعکس رخ شیطانی طرز فکر ہے۔ جب شیطانی طرز فکر تناور درخت بنتی ہے تو شاخوں پر وہم، پریشانی، نافرمانی، خوف، بے سکونی، کینہ اور حسد جیسے پھل لگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

'' اور ناپاک بات کی مثال ایک بری ذات کے درخت کی ہے جو زمین کی سطح سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے، اس کے لئے کوئی استحکام نہیں ہے۔'' (ابراھیم: ۲۶)

اللہ سے دوری شک اور بے یقینی کو جنم دیتی ہے۔ جس دماغ میں شک ہے وہاں شیطنت ہے اور جہاں اللہ ہے وہاں یقین ہے — اور یقین قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھنے سے مستحکم ہوتا ہے۔

ہم آسودہ یا غم زدہ زندگی گزارنے کے قانون سے ناواقف ہیں اور آسودگی کے حصول کے لیے ایسے قدم اٹھا لیتے ہیں جن میں مایوسی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ زندگی کا تجزیہ کریں تو آدھی سے زیادہ مایوسی میں گزر جاتی ہے کیوں کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ کون سا راستہ ہے جہاں مسرت کی قندیلیں روشنی بکھیر رہی ہیں۔ وہ کون سی فضا ہے جس میں شبنم موتی بن جاتی ہے۔ وہ کون سا ماحول ہے جو پُرسکون ہے۔ وہ کون سی خوش بو ہے جس سے شعور روشن ہوتا ہے۔ ہم ناخوش اس لئے ہیں کہ اللہ کی رضا میں راضی نہیں رہتے اور اپنی مرضی کے نتائج چاہتے ہیں — یہ جانتے ہوئے کہ ہمارا علم محدود ہے۔ رحیم وکریم ہستی اللہ کا فرمان ہے،

''اور شاید تم کو بری لگے ایک چیز، اور وہ بہتر ہو تمہارے لئے۔ اور شاید تم کو اچھی لگے ایک چیز، اور وہ بری ہو تمہارے لئے۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔'' (البقرۃ: ۲۱۶)

ایک خاتون نے خط میں لکھا،

میرے شوہر لندن کی رنگین فضاؤں میں گم ہو گئے اور انہیں میرا کوئی خیال نہیں رہا۔ نشہ کی بری عادت کے سبب مار کٹائی سے بھی باز نہیں آتے تھے۔ آپ کو خط لکھ کر مسئلہ بتایا۔ آپ نے علاج تجویز کیا کہ اپنے شوہر کی بڑی تصویر بنا کر کمرے میں پیروں کے رخ

دیوار پر الٹی لٹکا دیں۔

میں نے یہاں ایک بہت اچھے مصور سے شوہر کی بہت اچھی خوب صورت رنگین تصویر بنوائی اور عمدہ قسم کے فریم میں لگوا کر حسب ہدایت تصویر کو الٹا لٹکا دیا۔ تصویر میرے اور شوہر کے درمیان ضد اور بحث کا موضوع بن گئی۔ شوہر نے مجھ سے قطعاً لاپروائی اختیار کر لی اور بات چیت بند کر دی۔

ہوتا یہ تھا کہ شوہر جیسے ہی کمرے میں داخل ہوتے، تصویر سیدھی کر دیتے اور جیسے ہی وہ کمرے سے باہر نکلتے میں تصویر کو الٹا کر دیتی۔ اس خاموش لڑائی یا ذہنی کش مکش نے یہ رخ اختیار کیا کہ شوہر نے اپنا سرہانا پیروں کی طرف کر لیا تا کہ لیٹتے وقت انہیں تصویر نظر نہ آئے۔ میں نے تصویر اتار کر دوسری طرف لٹکا دی جہاں لازماً ان کی نظر پڑے۔ یہ سلسلہ اکیس روز تک یوں ہی چلتا رہا۔ بالآخر ایک دن انہوں نے مجھ سے ازخود بات کی۔ اکیس روز کے عرصہ میں ان کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ یہ تھے۔

''میں اب بہت تھک گیا ہوں، ٹوٹ گیا ہوں۔ اگر ہم دونوں ذہنی طور پر ہم آہنگ نہیں ہوئے تو میں بکھر جاؤں گا۔''

تصویر کا الٹ پھیر جاری رہا۔ آپ کی ہدایت تھی کہ شوہر کتنا ہی احتجاج کریں، تصویر سیدھی نہ ہونے دیں۔

اب صورت حال یہ ہے کہ شوہر گھر پر وقت کی پابندی کے ساتھ آتے جاتے ہیں۔ نشہ کم کر دیا ہے، لیکن ابھی تک وہ پوری طرح میری طرف متوجہ نہیں ہوئے البتہ ضروریات کا کافی حد تک خیال رکھتے ہیں۔ کیا تصویر الٹنے کا عمل جاری رکھوں—؟

خط کے جواب میں خاتون کو بتایا گیا،

''تصویر الٹنے کا عمل جاری رکھیں لیکن اس میں یہ تبدیلی کر لیں کہ جب آپ کے شوہر سو جائیں، تصویر الٹی کر دیں اور ان کے بیدار ہونے سے پہلے تصویر کو سیدھا کر دیں۔ گیارہ روز یہ عمل کرنے کے بعد تصویر کو اس کمرے سے الگ کر دیں اور تصویر کی جگہ اپنی اور اپنے شوہر کی تصویر لٹکا دیں۔ اتاری ہوئی تصویر کو سمندر سپرد کر دیں۔''

(قسط: ۴)

گیلی مٹی — پختہ اینٹ

حضرت شہاب الدین سہروردیؒ فرماتے ہیں— حق الیقین وہ حالت ہے جو پردۂ قلب کو چاک کر کے قلب کے مرکز میں نقطۂ سیاہ تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ نوع آدم کے لئے بہترین عطیہ، عمدہ اور اشرف حال ہے۔ اس حال اور مشاہدہ کا وہی تعلق ہے جو پختہ اینٹ کا خاک سے ہوتا ہے۔ خاک پہلے گیلی مٹی بنتی ہے پھر کچی اینٹ اور آخر میں پختہ اینٹ بنتی ہے۔ اسی طرح مشاہدہ اصل بنیاد ہے۔ مشاہدہ سے خاکی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ پھر کچی اینٹ کی مانند بقا کا وجود ہوتا ہے۔ اس کے بعد حق الیقین حاصل ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر نعیم ظفر

پھولنا اور سمٹنا خمیر ہے

''اور ہم نے زمین کو پھیلایا، اس میں پہاڑ رکھے اور اس میں ہر شے مقدار کے ساتھ اگائی۔'' (الحجر: ۱۹)

واقفِ اسرارِ کائنات قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں:

باغوں میں جو قمریاں ہیں سب مٹی ہیں
پانی میں جو مچھلیاں ہیں سب مٹی ہیں
آنکھوں کا فریب ہے یہ ساری دنیا
پھولوں میں جو تتلیاں ہیں سب مٹی ہیں

مظاہر کائنات کے پس پردہ فعال عناصر، عناصر میں مقداروں کی ترتیب اور زمان و مکان کے باہمی ربط کو ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ نے رباعی میں سادگی سے بیان کر دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہر شے مٹی کے چند مرحلے ہیں۔ پرندے، مچھلیاں، تتلیاں، آنکھوں کا نور، آواز میں شیرینی، گلاب کی پنکھڑی، ساغر، کوزہ و کمہار — سب مٹی کے ٹوٹنے، ٹوٹ کر بکھرنے — اور پھر جڑنے کے مدارج ہیں۔ ایسی کتنی ہی شکست و ریخت کی صدا ہے آدمی!

آخری الہامی کتاب میں خالق کائنات فرماتے ہیں،

''وہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور وہی مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور وہی زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔ اور اس طرح تم دوبارہ زمین میں سے نکالے جاؤ گے۔'' (الروم: ۱۹)

مظاہراتی دنیا مٹی کے خمیر کا خمار دکھائی دیتی ہے۔ محققین بتاتے ہیں کہ یہ مظاہراتی دنیا بہت سے عناصر سے مرکب ہے۔ عناصر علامات یعنی نمبروں کی خاص ترکیب سے ترتیب پاتے ہیں۔ ترتیب عام طور پر حسابی عمل سے حاصل کی جاتی ہے جن میں جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم کا طریقِ کار معروف ہے۔ ان کو چار بنیادی حسابی اعمال بھی کہا جاتا ہے۔

اعلیٰ ثانوی جماعتوں میں حسابی عمل کے دیگر طریقِ کار پر بھی بحث کی جاتی ہے جیسے الجبرا، ٹرگنومیٹری، لوگارتھم اور کیلکولس وغیرہ۔ حسابی عمل کے ذریعہ ہم مظاہراتی دنیا کی ترکیب، کارفرما عناصر کی ترتیب اور توازن کی ایکویشن حاصل کرتے ہیں۔

قارئین اس نقطہ سے واقف ہیں کہ ایکویشن ہمیشہ صفر کے برابر لکھی جاتی ہے۔ مگر کیا آپ جانتے ہیں اسے صفر کے برابر کیوں لکھا جاتا ہے؟

دراصل مظاہرات سے متعلق ایکویشن کو ہمیشہ صفر کے برابر کیا جاتا ہے جس کا مطلب ہے کہ مظاہراتی دنیا

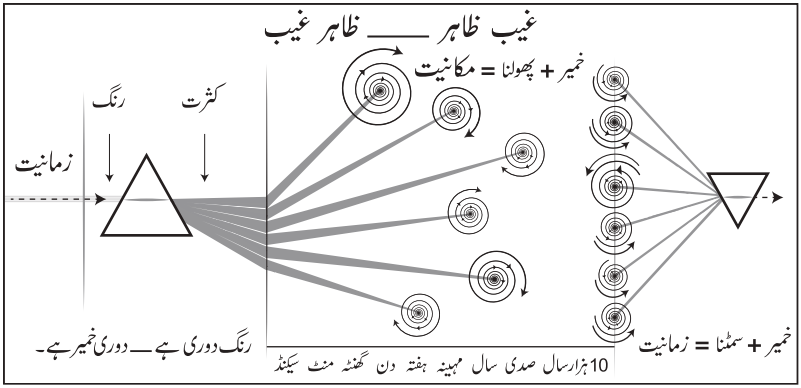

میں عناصر کی مقداریں توازن کے ساتھ موجود ہیں۔

لوگارتھم حسابی عمل ہے جس میں مقداروں کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔نتیجہ میں ظاہری خدوخال، جسامت و رنگ اور دیگر طبعی خواص نمو پاتے ہیں۔علمائے باطن اس طرز کو شے میں تصرف کرنا کہتے ہیں۔شے کی نشوونما میں پھیلاؤ اور سکڑاؤ کا عمل جاری رہتا ہے۔پھیلنا اور سکڑنا ـــ دونوں عمل عام طور پر خمیر کے نام سے جانے جاتے ہیں۔خمیر پھیلتا ہے اور خمیر سکڑتا ہے۔پھیلنے اور سکڑنے سے متعلق اطلاعات کہیں سے آتی ہیں، ان اطلاعات میں مقداریں مخفی ہوتی ہیں جو بتدریج مظاہرہ میں ڈھلتی جاتی ہیں، عروج پر پہنچتی ہیں پھر سکڑ کر نظر سے اوجھل ہوجاتی ہیں۔

مضمون میں اطلاعات کی وصولی، زمانیت کا کردار، رنگ و بو کی دنیا کی مکانیت میں غیب، حاضر، غیب کے درجات اور اہم تخلیقی عمل یعنی عملِ خمیر کے کردار کا جائزہ لیں گے۔اس ضمن میں مشہور مسلم ریاضی دان عبداللہ بن محمد بن موسیٰ خوارزمی کے وضع کردہ حسابی عمل لوگارتھم کی حقیقت کا بھی ذکر کریں گے جس کے تحت محققین عناصر کی متعین مقداروں کے پھیلنے اور سمٹنے کا اندازہ کرتے ہیں۔مضمون کا خلاصہ تصویر میں پیش کیا گیا ہے۔

ہم جس دنیا میں رہتے ہیں وہ غیب سے ظاہر اور ظاہر سے غیب ہوجاتی ہے۔غائب سے حاضر ہونا اور حاضر سے غائب ہوجانے میں وقفہ، دوری ہے۔شے چاہے کسی حالت میں ہو ـــ دیدہ و نادیدہ، مجرد و مرکب بہرحال وجود رکھتی ہے۔شے جب تک موجود ہے ہم اسے حاضر یا زندہ ہونا سمجھتے ہیں۔اس کے وجود یا مظاہرہ کا دائرہ کار صرف اور صرف ہماری معلوم دنیا تک محدود ہوتا ہے۔نادیدہ شے کی اسپیس جب پھیلتی ہے تو مادی حواس (مثلاً آنکھ) کے دائرہ کار میں آجاتی ہے۔

حواس سے مراد مادی آلات بھی ہیں جو دیدہ نادیدہ شے کو حواس تک لے آتے ہیں۔خوردبین، دوربین،

مائیکرو ویو آلۂ سماعت وغیرہ اس کی مثال ہیں۔ شے بتدریج نشوونما پاتی ہوئی مختلف مدارج سے گزرتی ہے۔۔۔ مادی حواس کے لئے ظاہر ہوتی ہے اور بالآخر محدود حواس کی رینج سے اوجھل ہوجاتی ہے۔ سائنسی زبان میں اس طریقِ کار کو fermentation یعنی عملِ خمیر کہتے ہیں۔

یونانی فلسفی خمیر کے عمل میں ہوا، پانی، مٹی اور آگ کو بنیادی عناصر بتاتے ہیں۔ فی زمانہ کیمیادان انہی عناصر کو لگ بھگ 118 مختلف ناموں سے موسوم کرتے ہیں جیسے کاربن، ہائیڈروجن، آکسیجن، کیلشیم اور یورینیم وغیرہ۔ عملِ خمیر کو آپ ہر اس شے میں دیکھ سکتے ہیں جو نفی سے اثبات اور اثبات سے نفی کے ادوار سے گزرتی ہے۔ اگرچہ آدمی محدود اشیا میں نشوونما کے عمل کو جانتا ہے اور آدمی کی وضع کردہ ''جان دار'' کی تعریف بھی محدود ہے مگر علمائے باطن ہر موجود شے کو باشعور کہتے ہیں۔

محقق جن اشیا کو جان دار اور بے جان میں تقسیم کرتے ہیں، ان کی نشوونما کے عمل کے بارے میں محققین کی رائے ہر دور میں مختلف ہوجاتی ہے۔ وقفہ کو ہم عمر کا تعین کہہ سکتے ہیں۔ تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ آدمی کی اوسط عمر تین ہزار سال سے کم ہو کر فی زمانہ ستّر سال بتائی جاتی ہے۔

چند آبی وخاکی جانوروں کی عمر اس طرح سے ہے۔

گرین لینڈ شارک کی عمر 400 سال، ریڈ سی ارچن کی عمر 200 سال، ایل کی عمر 106 سال، مکاؤ طوطوں کی عمر 80 سال، افریقی ہاتھی کی عمر 70 سال، گیلپاگس کچھوے کی عمر 152 سال، وہیل مچھلی کی عمر 200 سال، پالتو خرگوش کی عمر دس سال، عام چوہوں کی عمر ایک سال، ڈریگن فلائی کی عمر چھ مہینے، عام مکھی کی عمر چار ہفتے اور مے فلائی (مکھی) کی عمر ایک دن ہے۔

عمر یا دوری کے وقفہ کا تعین گزرنے والے وقت سے کیا جاتا ہے۔ وقت کو ہم سیکنڈ، منٹ، گھنٹے، دن، ہفتہ، مہینہ اور سالوں میں ریکارڈ کرتے ہیں۔ وقت کو احساس کی طرح محسوس کیا جاتا ہے۔ آدمی جسے وقت کے نام سے جانتا ہے وہ دراصل آدمی کے احساس کی درجہ بندی ہے۔ اگر آنکھ کے سامنے درخت ہو تو نظر درخت کی اسپیس کی پیمائش جسامت، رنگ و بو اور شکل وغیرہ میں کرتی ہے۔ اسی طرح وقت بھی حس ہے۔

> ہر وہ پیمائش جسے آدمی محدود حواس میں محسوس کرتا ہے، باطنی علمائے کرام اسے فکشن کہتے ہیں۔ قارئین اس جملے پر یک سوئی کے ساتھ غور کریں۔

طالبات وطلبا وقت کو تیسری یا چوتھی ڈائی مینشن کے نام سے جانتے ہیں جو بہرحال مکانیت (اسپیس) ہے۔ ایسی مکانیت یا احساس جسے مختلف شکلوں میں

مادی گھڑی کی صورت میں ریکارڈ کیا جاتا ہے۔

اصل وقت کیا ہے اور وقت دراصل کیا ہے ــــ؟

قارئین کے تفکر کے لئے ایک اشارہ دینا بے جا نہ ہوگا اور وہ یہ ہے کہ وقت کو الہامی کتب میں ''زمان'' کے نام سے متعارف کرایا گیا ہے۔ زمان کے معنی میں بہت وسعت ہے۔ روایتی معنوں کے برعکس زمان مکان کی تخلیق کرتا ہے۔

زمان کے پاس مکانیت اور مکانیت میں خدوخال کے تمام تناسب (فارمولے) موجود ہیں۔ فارمولے دھیرے دھیرے نمودار ہوکر یک جا ہوتے ہیں اور مظاہرہ بنتے جاتے ہیں جیسے بیج سے کونپل نمودار ہوتی ہے۔ بظاہر مادی عوامل بتدریج کونپل کی افزائش کرتے ہیں یہاں تک کہ کونپل سے پودا، جھاڑ، درخت اور پیڑ بن جاتا ہے۔ یہ سب ان اطلاعات سے اخذ کردہ مقداریں ہیں جو درحقیقت زمان میں مخفی ہیں۔

مخلوق جس شکل میں اور جہاں بھی موجود ہے، بیج سے تخلیق ہوتی ہے۔ آپ اسے بیج کہیں، اسپرم کا نام دیں، جڑ سمجھیں، خلیہ کہیں یا کوئی جینیاتی جزو ــــ ابتدا بیج سے ہوتی ہے۔ موجودہ دور میں علمی کم مائیگی کا یہ عالم ہے کہ محققین کی جانب سے چٹانوں، پہاڑوں، ہوا، سمندر، زمین، بادل، لاوا، دریا اور چشموں کے، بیج سے پیدا ہونے کی کوئی تحقیق سامنے نہیں آئی جب کہ ان کے بیج ہوتے ہیں۔

ہر شے جان دار اور باحواس ہے۔ اس فہرست میں آدمی، آبی وخاکی پودے، درخت، حیوانات، پرندے، جانور، پتھر، پہاڑ، ہوا، لکڑی وغیرہ کا ذکر آتا ہے۔

کتاب ''محمد رسول اللہؐ جلد دوئم'' میں ہوا کی تخلیق میں بیج کا ذکر کیا گیا ہے۔ جناب عظیمی صاحب نے انکشاف کیا ہے کہ

''ہوا ایک جرثومہ ہے جو ثابت مسور کی دال کی طرح ہے۔ یہ گول، چپٹا اور چکنا جرثومہ بیکٹیریا سے زیادہ چھوٹا اور بیکٹیریا سے زیادہ تیزی سے نشوونما پاتا ہے۔ ہوا کی تخلیق کے زون کھلے ریگستان اور سمندر کی اندرونی سطح ہے۔''

مزید تفصیلات کے لئے باطنی علم کے متلاشی، غوروفکر کرنے والے خواتین وحضرات یقیناً کتاب سے رجوع کریں گے۔

سب جانتے ہیں کہ پرندے انڈوں سے پیدا ہوتے ہیں، نباتات بیج سے، آدمی اور حیوانات کی بڑی تعداد کی ابتدا اسپرم سے ہوتی ہے۔ ان میں ایک، دو اور چار پاؤں والے جان دار شامل ہیں۔ پیدائش کے عمل میں بنیادی کردار ادا کرنے والے چھوٹے جان دار خوردبینی زبان میں خلیہ کہلاتے ہیں۔ عام اصطلاح میں انہیں کیڑے کہا جاسکتا ہے۔ مضمون میں خوردبینی مخلوق کو کیڑے کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

آدمی بھی اس طرح کے بہت سے کیڑوں کا مرکب

ہے۔حیوانات ہوں، نباتات ہوں یا دیگر مخلوقات — کیڑوں کی مخصوص مقدار اکھٹی ہوتی ہے جو خاص ترتیب میں ڈھل کر آدمی اور جانوروں میں ناک، آنکھیں، کان، گردے، پھیپھڑے اور دیگر اعضا— اسی طرح نباتات میں پتے، شاخیں، تنا، جڑیں، شگوفے، زیر دانے اور پھل وغیرہ بناتی ہے۔ سائنس نے اس علم کو Cytology کا نام دیا ہے۔ تمام جان دار اس طرح کے چھوٹے چھوٹے کیڑوں سے مرکب ہیں اور آپ انہیں بیکٹیریا کے نام سے جانتے ہیں۔

جسم کی بیکٹیریا سے تشکیل سمجھنے کے لئے چند مثالیں:

ا۔ محققین نے جان لیا ہے کہ گاڑیوں میں استعمال ہونے والا ڈیزل اور پیٹرول مختلف بیکٹیریا کی مرکب شکل ہے۔ ڈیزل میں ایسے بیکٹیریا ختم کردیئے جاتے ہیں جو انجن میں جلنے کے بعد دھوئیں کا سبب بنتے ہیں۔

۲۔ دودھ میں سے ایسے بیکٹیریا نکال دیئے جاتے ہیں جو بالائی اور چربی بنانے میں کام آتے ہیں۔ مگر آپ کو معلوم ہوگا کہ ڈبوں میں ملنے والے دودھ سے دہی نہیں بنتی۔ وجہ ان میں تخلیقی بیکٹیریا (کیڑے) موجود نہ ہونا ہے۔

۳۔ قرآن کریم میں کائنات کی پیدائش اور نظام کو جاری رکھنے کے لئے کارفرما عوامل کا ذکر جابجا ہے۔

''اور ہم نے انسان کو کھنکھناتے سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا۔'' (الحجر:۲۶)

حواس سے مراد مادی آلات بھی ہیں جو دیدہ نادیدہ شے کو حواس تک لے آتے ہیں۔ خوردبین، دوربین، مائیکروویو آلۂ سماعت وغیرہ اس کی مثال ہیں۔ شے بتدریج نشوونما پاتی ہوئی مختلف مدارج سے گزرتی ہے— مادی حواس کے لئے ظاہر ہوتی ہے اور بالآخر محدود حواس کی رینج سے اوجھل ہوجاتی ہے۔ سائنسی زبان میں اس طریقِ کار کو fermentation یعنی عملِ خمیر کہتے ہیں۔

ہر تخلیق میں نمو ہوتی ہے جو نشوونما پاکر مختلف ادوار سے گزرتی ہے اور بالآخر معدوم ہوجاتی ہے۔ باطنی علوم کے ماہرین وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ شے زمان سے وجود میں آتی ہے۔ وجود اسپیس ہے اور اسپیس میں نشوونما پاتا ہے۔ ریت کے ذرّہ سے چھوٹا خوردبینی وجود مختلف مراحل سے گزر کر جوان اور بوڑھا ہوتا ہے۔ اسپیس اسے نشوونما دے کر جوان کرتی ہے اور وہ اسی اسپیس میں خاک ہوجاتا ہے۔ یہ وہی اسپیس ہے جہاں آدمی، درخت، چیونٹی، بلی اور وہیل مچھلی وغیرہ عدم سے ظاہر ہوکر غائب ہوجاتے ہیں۔ شکست و ریخت کا یہ عمل تصویر میں دکھایا گیا ہے۔ مزید وضاحت مضمون کے بقیہ حصہ میں کی جائے گی۔ (قسط: ۱)

★ مضمون پڑھ کر آپ نے جو سمجھا— ادارہ کو لکھ کر بھیج دیجئے۔

مرزا اسداللہ خان غالبؔ

سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

گھر جب بنالیا ترے در پر کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر، کہے بغیر

کہتے ہیں، جب رہی نہ مجھے طاقت سخن
جانوں کسی کے دل کی میں کیوں کر کہے بغیر

کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے، وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے، نہ رہیں پر کہے بغیر

مقصد ہے نازو غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہئے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

غالبؔ نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

عابد محمود

ابھی مت جاؤ ــــ رک جاؤ

ہمارے پاس اپنے لئے دنیا مانگنے آتے ہو اور ماں کے لئے کہتے ہو کہ مجھ سے ان کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی، دعا کریں اللہ مشکل آسان کرے۔ شرم نہیں آتی! کسی ماں نے آج تک نہیں کہا کہ میرا بیٹا زندگی و موت کی کشمکش اور تکلیف میں ہے، دعا کریں کہ اللہ اس کی تکلیف ختم کر کے اس کو اپنے پاس بلا لے۔ جاؤ جس کی تمہارے جیسی اولاد ہو، اللہ اس ماں کی مشکل آسان کرے!

پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ زیرو واٹ کے بلب سے کمرے میں ہلکی نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر پانی کا گلاس اور جگ رکھا تھا۔ پوری قوت سے ساتھ والے کمرے میں بیٹے کو آواز دینے کی کوشش کی لیکن آواز خود اس کی سماعت تک نہیں پہنچی۔ بے بسی سے آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

لاغر ہاتھوں سے سائیڈ ٹیبل کو کھٹکھٹانے کی کوشش کی۔ دھیمی آواز پیدا ہوئی جو بمشکل اس کے کانوں تک پہنچ سکی۔ حواس مجتمع کرتے ہوئے دوبارہ سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا گلاس اٹھانے کی کوشش کی۔ بڑھاپے میں دایاں جسم مفلوج ہونے کے ساتھ قوت گویائی بھی متاثر ہوئی تھی۔ بولنے کی کوشش کرتی تو منہ سے غوں غوں کی آوازیں نکلتیں۔ بیٹا سننے کی کوشش کرتا پھر اکتائے ہوئے لہجہ میں کہتا، اماں پتہ نہیں کیا کہہ رہی ہو!

آنکھوں کی پتلیاں بیٹے کو دیکھ کر حیرت سے پھیل جاتیں اور وہ سوچتی کہ عمیر چھوٹا تھا تو میں کچھ کہے بغیر اس کی بات سمجھ جاتی تھی، پھر اسے ماں کی بات سمجھ میں کیوں نہیں آتی ــــ؟

ذہن میں ماضی کی رو چلنے لگتی۔ عمیر پیدا ہوا تو ایک سال تک خود سے کروٹ نہیں لے سکتا تھا۔ مکھیوں سے بچانے کے لئے ہاتھ کے پنکھے سے ہوا دیتی تھی۔

ذہن ماضی میں کھو گیا ــــ سنبل سخت سردی میں رضائی میں بچہ کو ساتھ لٹائے ٹھٹھر رہی تھی۔ جب سے عمیر پیدا ہوا تھا، زچگی سے ہونے والی کمزوری نے بے حال کر دیا تھا۔ پہلے بھی سردیاں آتی تھیں لیکن محسوس نہیں ہوتی تھیں۔ دل چاہا کہ گرم چائے پیئے۔ مگر رضائی چھوڑنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ عمیر نے رونا شروع کر دیا۔ وقت دیکھا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ماں جانتی ہے کہ بچہ کو بھوک کب لگتی ہے اور کب وہ بول و براز کرتا ہے۔ رونے کی آواز سے

پہچان جاتی ہے کہ پیٹ یا کان میں درد ہے۔

سائیڈ ٹیبل سے فیڈر اٹھایا اور پانی گرم کرنے کے لئے فوراً بستر چھوڑ دیا۔ کپکپاتی ہوئی باورچی خانہ میں چولہے پر دیگچی رکھ کر پانی گرم کرنے لگی۔ دودھ فیڈر میں ڈالا۔ عمیر کو گود میں لیا اور نیند بھری آنکھوں سے اسے دیکھا جو دودھ پیتے پیتے سو گیا تھا۔ بہت آہستگی سے جیسے ہی گود سے اتارا، اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔

سنبل نے بوجھل پلکوں سے دوبارہ گود میں لیا۔ گود میں آتے ہی وہ چپ ہو گیا اور سنبل بیٹھے بیٹھے ساری رات سوتی جاگتی رہی۔ بستر گیلا ہونے کا احساس ہوا۔ فوراً گیلی جگہ سے بچہ کو اٹھایا، اپنی جگہ پر لٹایا۔ اس کے کپڑے بدلے اور خود گیلی جگہ پر لیٹ گئی۔

پیاس کی شدت ماضی سے حال میں لے آئی۔ اپنی حالت دیکھ کر بے بسی کا احساس بڑھ گیا۔ گلاس اس کی پہنچ سے آٹھ نو انچ دور تھا۔ اس تک ہاتھ پہنچانے کی کوشش میں سانس پھول گیا۔ جیسے ہی گلاس پر ہاتھ لگا، گلاس ٹیبل سے گر گیا۔ شیشہ گرنے کی آواز سے ساتھ والے کمرے کی لائٹ جلی اور بہو بڑبڑاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔

سنبل کی رنگت سانولی تھی اس لئے رشتہ کے لئے آنے والوں نے رنگ کو جواز بنا کر اسے مسترد کر دیا۔ یہ خطرناک معاشرتی رویہ ہے جس نے بے شمار لڑکیوں کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچائی ہے اور احساس کم تری میں مبتلا کر رہا ہے۔ بالآخر اللہ نے مشکل آسان کی اور جمیل کا رشتہ آیا۔ شادی کے وقت سنبل کی عمر 25 سال تھی۔ خوش قسمتی تھی کہ شوہر اس کا ہم مزاج تھا۔ شادی کے ڈیڑھ سال بعد اللہ نے اولاد سے نوازا۔ عمیر دس ماہ کا تھا کہ جمیل کی سڑک حادثہ میں موت ہو گئی۔

شوہر کی موت کی خبر سنبل پر بجلی بن کر گری اور وہ کتنے دن اس بات کو قبول نہ کر سکی کہ وہ بیوہ ہے۔ جمیل کے جانے کے بعد سسرال والوں کے رویہ سے دل برداشتہ ہو کر ماں باپ کے گھر منتقل ہونا پڑا۔

جوانی میں بیوگی کا روگ چیلنج بن جاتا ہے۔ بیوہ یا مطلقہ سے شادی ہمارے معاشرہ میں وہی کرتے ہیں جو خود تین یا چار بچوں کے باپ ہوتے ہیں۔ ماں باپ نے ہر ممکن کوشش کی کہ سنبل دوسری شادی کے لئے راضی ہو جائے۔ اصرار پر اس نے ہامی بھر لی لیکن جو رشتہ آیا، باپ کی عمر کا تھا۔ وہ خود کو راضی نہ کر سکی۔

سانولی رنگت صرف ازدواجی رشتہ کے وقت خامی ہوتی ہے مگر جاب کے وقت باس ان چیزوں کو نہیں دیکھتا۔ اس بات کا احساس سنبل کو ملازمت کے وقت ہوا۔ ملازمت کے لئے درخواست دی، جلد انٹرویو کے لئے بلا لیا گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی باس نے سر سے پیر تک عجیب نظروں سے دیکھا۔

باس نے بتایا کہ ہمیں تجربہ کار بندہ کی ضرورت ہے، جو اکاؤنٹس میں مہارت رکھتا ہو اور فیکٹری میں کام

کرنے کا کم سے کم پانچ سال کا تجربہ ہو۔لیکن آپ کی معصومیت دیکھ کر میں آپ کو جاب پر رکھ سکتا ہوں۔

یہ کہتے ہوئے ہاتھ سنبل کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

سنبل نے ہاتھ کھینچا اور تیزی سے آفس سے نکل گئی۔ گھر آ کر کتنی دیر ذلّت کے احساس سے روتی رہی۔ بیٹے کو گود میں اٹھایا۔ جانتی تھی کہ آگے تلخ تجربات منتظر ہیں اور یہ صرف ابتدا ہے۔

عمیر کے مستقبل کو دیکھتے ہوئے نئے عزم کے ساتھ سی وی کی مزید فوٹو کاپیاں کروا کر مختلف فیکٹریوں میں بھیجنے لگی۔ جذبات و احساسات کچل کر زندگی بیٹے کے لئے وقف کر دی۔ صبح گھر سے نکلتی اور شام چھ بجے گھر واپس آتی۔ نانی عمیر کا دھیان رکھتی تھیں۔

ابتدا میں وہ گھر سے باہر کی زندگی سے گھبرا گئی۔ ایک دن پُرعزم لہجہ میں خود سے کہا، جب مجھے ملازمت کرنی ہی ہے تو بہادری کے ساتھ جینا ہوگا تاکہ مخاطب بات کرتے ہوئے احتیاط کرے۔ شام کو تھکی ہاری گھر پہنچتی تو عمیر اسکول کے ہوم ورک کے لئے اس کا منتظر ہوتا تھا۔ تازہ دم ہو کر بیٹے کے پاس بیٹھ جاتی اور ساتھ میں رات کے کھانے کا انتظام بھی کرتی۔ ماں باپ بوڑھے تھے۔ ان پر بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی۔ اس نے ماں باپ کا بھی خیال رکھا۔ ماں باپ بیٹی کو دیکھ کر کڑھتے تھے۔

سنبل نے سستے اور پرانے سوٹ پہن کر جوانی کے دن گزار دیئے۔ بناؤ سنگھار تو جیسے وہ بھول گئی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ جذبات مر گئے تھے، دل میں ہزاروں ارمان کروٹیں لیتے لیکن بیٹے کی خاطر ارمانوں کا گلا گھونٹ دیا۔ وقت گزرا۔ اماں ابا بھی رخصت ہوئے۔

عمیر کو کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرز کروایا۔ بعد ازاں اسے ملٹی نیشنل کمپنی میں پُرکشش تنخواہ پر ملازمت مل گئی۔ اس نے ماں کی ملازمت چھڑوا دی۔

ایک دن عمیر دبلی پتلی نازک سی لڑکی کے ساتھ گھر میں داخل ہوا اور بولا، اماں یہ نوشین ہے میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔ سنبل نے لڑکی کو غور سے دیکھا۔ پھر چہرہ پر سرخی دیکھ کر سمجھ گئی کہ کیا ماجرا ہے۔ لڑکی کی پیشانی چومی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ خاندان کے بارے میں پوچھا۔

بعد میں عمیر نے اماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا، اماں! نوشین کیسی لگی؟ ماں نے انجان بنتے ہوئے کہا، ہاں اچھی ہے۔ یہ لو پیسے اور ساتھ والے اسٹور سے ایک پاؤ مرچیں لے آؤ۔ لا دیتا ہوں پہلے بتائیں کہ نوشین کیسی لگی۔ ہاں بھئی اچھی ہے۔ ظاہر ہے اس عمر میں لڑکیاں ویسے ہی اچھی لگتی ہیں۔ ماشاء اللہ خوب صورت ہے۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ پھر ہنستے ہوئے عمیر کو قریب کیا اور بولی، میرا بیٹا بڑا ہو گیا، مجھے پتہ نہیں چلا۔ تمہیں پسند ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ کیا اس کے گھر والے راضی ہیں۔

ہاں اماں وہ راضی ہیں۔ بس آپ کی اجازت چاہئے

تھی۔عمیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

توقعات ہمیشہ آدمی کو توڑ دیتی ہیں۔ محبت کے ہزاروں کرشمے ہیں ان میں سے ایک توقع ہے۔آدمی توقع کی چکی میں پس جاتا ہے۔عمیر جس کے لئے اس نے زندگی کے ہر موڑ پر قربانی دی، بیوی کے آتے ہی ماں سے دور ہونے لگا۔

عمیر مجھے پسند نہیں ہے کہ تمہاری ماں ہر وقت گھر کے کاموں میں ٹوکتی رہے۔ان کو میرا کوئی کام اچھا نہیں لگتا۔ہر وقت کی چخ چخ سے تنگ آ گئی ہوں۔نوشین نے عمیر کے سامنے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

اماں دل کی بہت اچھی ہیں۔ دن رات میرے مستقبل کے لئے وقف کر دیئے۔آج ان کی وجہ سے میں اس مقام پر ہوں۔انہیں سلیقہ پسند ہے۔

کیا میں بے سلیقہ ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ گھر کو کیسے رکھتے ہیں۔آپ کا مطلب ہے میرے والدین نے مجھے سلیقہ نہیں سکھایا۔نوشین ناراض ہوگئی۔

میں نے یہ کب کہا۔ میں تو کہہ رہا ہوں کہ کوشش کرو کہ اماں جیسا چاہتی ہیں ویسا کر لیا کرو۔خوش ہو جائیں گی۔گھگیائے ہوئے لہجہ میں بولا۔

مجھ سے نہیں ہوتا۔علیحدہ گھر دیکھ لیں۔آپ کی اماں کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔نوشین منہ بناتے ہوئے بولی۔

یہ کیسے ہوسکتا ہے۔اماں کہاں جائیں گی؟

یہ آپ سوچیں، میرا مسئلہ نہیں ہے۔ میرے والدین نے اس لئے نہیں پڑھایا کہ پڑھ لکھ کر گھر میں کام والی بن جاؤں اور ہنڈیا دیکھتی رہوں ۔ ایسا کریں کہ مجھے نوکری کرنے دیں تا کہ گھر سے جان چھوٹ جائے۔ یہ کہہ کر نوشین نے آنسو بہانے شروع کر دیئے۔

عمیر بیگم کے آنسوؤں کے آگے ہار گیا۔

سنبل کو احساس ہوا کہ بیٹا کھچا کھچا رہتا ہے۔میاں بیوی کام پر چلے جاتے اور وہ سارا دن گھر میں اکیلی ہوتی۔ بہو کے رویہ سے وہ سمجھ گئی کہ اب اسے گھر عمیر کے حوالے کر کے گھریلو معاملات سے آزاد ہو جانا چاہئے۔ بالائی منزل پر کمرہ صاف کیا اور اس کمرے تک محدود ہوگئی۔ سارا دن کتابوں کا مطالعہ کرتی اور رات کو عبادت میں وقت گزارتی۔ اللہ نے خوب صورت پوتی دی۔سنبل نے خود کو ننھی گڑیا ماہ رخ میں مصروف کر دیا۔سارا دن بچی سے کھیلتی۔شام کو بہو اور بیٹا گھر لوٹتے تو بچی ان کے حوالہ کر کے کمرے میں لوٹ آتی۔اس کی حیثیت آیا سے زیادہ نہیں تھی۔

عمیر اور نوشین ماہ رخ کے ساتھ شادی کی تقریب میں شرکت کے لئے گئے ہوئے تھے۔صبح سے سنبل کی کنپٹیوں میں ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ بلڈ پریشر کی گولی کھائی اور لیٹ گئی۔ اچانک محسوس ہوا کہ دائیں بازو اور پیر نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے اور جبڑا کوشش کے باوجود نہیں ہل رہا۔ بولنے کی کوشش کی لیکن زبان محض گوشت کا ٹکڑا ثابت ہوئی۔ وہ گھبرا گئی۔چیخنا چاہا مگر آواز

اس کی اپنی سماعت میں بھی نہ پہنچ سکی۔

رات کو عمیر اور نوشین واپس آئے۔ عمیر ماں کے کمرے میں داخل ہوا اور ان کی حالت دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ اماں کیا ہوا؟ آنسو سنبل کے گالوں پر بہنے لگے۔

نوشین گلاس کی کرچیاں دیکھ کر بڑبڑاتے ہوئے بولی، سارا دن آفس میں کام کرو اور رات کو بڑھیا کے لئے جاگتے رہو۔ میرے نصیب میں تو آرام ہی نہیں۔ گلاس میں پانی ڈالا اور ناگواری سے اماں کو پانی پلاتے ہوئے بڑبڑاتی رہی۔ عمیر بھی گلاس گرنے کی آواز سن کر اٹھ گیا تھا۔ نوشین کی ناگواری دیکھ کر ماں کو گھورتے ہوئے بولا، اماں کتنی بار کہا ہے کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو ٹیبل کھٹکھٹا دیا کریں، میں آجاؤں گا لیکن آپ! ہم ڈر گئے کہ اللہ رحم کرے کیا ہوگیا۔

نوشین تم سو جاؤ میں اماں کے پاس بیٹھتا ہوں۔

نوشین بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

اماں آپ سمجھتی کیوں نہیں، وہ بے چاری سارا دن دفتر میں الجھی رہتی ہے۔ اسے آرام کی ضرورت ہے۔ سب کچھ تو آپ کے پاس رکھا ہے۔ آپ کے لئے کھانا بنانا، گھر داری، بچی کی دیکھ بھال، دفتر کے کام، آخر وہ بھی انسان ہے مشین نہیں۔

سنبل نے مسکراتے ہوئے بیٹے کی بہو کے لیے محبت دیکھی اور سوچنے لگی چلو عمیر کو کسی سے تو محبت کرنا آئی۔ ہاتھ کے اشارہ سے کہا، جاؤ میں ٹھیک ہوں۔

عمیر کمرے میں نوشین کے پاس بیٹھ کر موڈ درست کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ عمیر تم سے کتنی بار کہا ہے کہ دن کی طرح رات میں بھی آیا رکھ لو۔ آفس کے بعد مجھ سے تیمارداری نہیں ہوتی۔ اتنا ہی شوق ہے ان کی تیمارداری کا تو ان کے کمرے میں سو جایا کرو۔ پتہ نہیں اس بوجھ کو کب تک اٹھاتے پھریں گے۔

نوشین، اماں بے چاری سالوں سے بیماری جھیل رہی ہیں۔ ان پر ترس آتا ہے۔ دعا کرو کہ اللہ ان کی مشکل آسان کرے اور اپنے پاس بلا لے۔

سنبل نے بیٹے اور بہو کی باتیں سنیں تو آنسو آنکھوں کے گرد بنے گہرے حلقوں میں جمع ہوگئے۔ بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھا۔

بابا میری ماں کے لیے دعا کریں کہ وہ ٹھیک ہو جائیں بہت تکلیف میں ہیں۔ اس عمر میں ان کو تکلیف میں دیکھتا ہوں تو کلیجا پھٹنے لگتا ہے۔ دعا کریں کہ اللہ ان کی مشکل آسان کرے اور اپنے پاس بلا لے۔

فقیر نے ناگواری سے عمیر کی طرف دیکھا اور بولے، پتر ماں جیسی ہستی اس دنیا میں نہیں۔ اللہ فرماتا ہے کہ میں ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہوں۔ یہ وہی ماں ہے جس نے تمہیں پیٹ میں نو ماہ رکھا اور خون کے قطرے پلا کر دنیا میں لائی۔ خود گیلے میں سوتی رہی تمہیں سوکھے میں سلایا۔ تمہاری ہر ضرورت کا دھیان رکھنا اپنے اوپر فرض کرلیا۔ افسوس! بچوں کو پالنے والے ماں باپ کو

بڑھاپے میں اولاد مل کر نہیں پال سکتی! اولاد کے پاس وہ دل نہیں ہوتا جو ماں باپ کے پاس ہے۔ یہ دنیا فانی ہے اور یہاں فرد کا فرد سے رشتہ بھی فانی ہے۔ جو بچے ماں باپ کی قدر نہ کریں، ان سے کیا بعید!

عمیر شرمندہ ہو گیا۔ بزرگ غصہ میں تھے۔

ہمارے پاس اپنے لئے دنیا مانگنے آتے ہو اور ماں کے لئے کہتے ہو کہ مجھ سے ان کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی، دعا کریں اللہ مشکل آسان کرے۔ شرم نہیں آتی!

کسی ماں نے آج تک نہیں کہا کہ میرا بیٹا زندگی و موت کی کشمکش اور تکلیف میں ہے، دعا کریں کہ اللہ اس کی تکلیف ختم کر کے اس کو اپنے پاس بلا لے۔

جاؤ جس کی تمہارے جیسی اولاد ہو، اللہ اس ماں کی مشکل آسان کرے!

عمیر شرمندگی سے سر اٹھا نہ سکا۔ بوجھل قدموں سے لوٹ آیا۔ سارا راستہ اماں کا ہنستا مسکراتا چہرہ اور گزری ہوئی زندگی فلم بن گئی۔ صبح صبح اماں کی تیاری، ناشتا کروا کر اسکول چھوڑنا، کام پر جانا، شام کو گھر آتے ہی کھانا بنانا، اس کے ساتھ بیٹھنا، ساری ضروریات پوری کرنا — اس نے اماں کو مشین کی طرح کام کرتے دیکھا تھا۔ یاد نہیں کہ اماں نے کبھی اچھا لباس پہنا ہو، جو تھا سب اس پر قربان کر دیا یہاں تک کہ اپنی جوانی بھی۔ تصور میں بستر پر لیٹی ہوئی بے بس ماں کے چہرہ نے بے چین کر دیا، وہ فوراً ان کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔

اک سچی اماں کی کہانی

میرے بچے یہ کہتے ہیں
''تم آتی ہو تو گھر میں رونقیں خوش بوئیں آتی ہیں
یہ جنت جو ملی ہے سب انہی قدموں کی برکت ہے
ہمارے واسطے رکھنا تمہارا اک سعادت ہے''
بڑی مشکل سے میں دامن چھڑا کر لوٹ آئی ہوں
وہ آنسو اور وہ غمگین چہرے یاد آتے ہیں
ابھی مت جاؤ رک جاؤ یہ جملے ستاتے ہیں
میں یہ ساری کہانی آنے والوں کو سناتی ہوں
میرے لہجے سے لپٹا جھوٹ سب پہچان جاتے ہیں
بہت تہذیب والے لوگ ہیں سب مان جاتے ہیں

(نظم: زہرا نگاہ)

کمرے میں داخل ہوتے ہی اماں کو آواز دی۔ وہ پُرسکون چہرہ سو رہی تھیں۔ عمیر نے مدتوں بعد اماں کے لئے سوٹ خریدا تھا۔ لفافہ میں سے سوٹ نکالا اور آواز دے کر بولا، اماں دیکھیں سوٹ لایا ہوں، آپ کو ہلکے رنگ بہت پسند ہیں۔

لیکن ماں کے جسم میں حرکت نہیں ہوئی۔ عمیر کو عجیب احساس نے آگھیرا۔ آگے بڑھ کر ہلایا جلایا۔

بایاں ہاتھ جو فالج سے محفوظ تھا، ڈھلک گیا۔

اللہ نے اس کی اماں کی مشکل آسان کر دی تھی!

انا للہ وانا الیہ رجعون

نفیسہ شاکر

نگاہوں کو زباں دل کو نظر دی جائے

بڑھاپے کو ضعیفی سمجھا جاتا ہے جب کہ ہمارے سامنے ایسی مثالیں ہیں کہ جو لوگ اللہ کی محبت میں، خدمت خلق یا کسی تعمیری مقصد کے تحت زندگی گزارتے ہیں، وہ بوڑھے ہوجاتے ہیں، ضعیف نہیں ہوتے۔ضعف دراصل ارادہ کی کم زوری ہے۔

فطرت اور خوشی ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ہم فطرت میں موجود خوشی کی اہمیت کو نظر انداز کردیتے ہیں جس سے فطرت مغلوب ہوکر جبلت غالب ہوجاتی ہے۔ جبلت بیرونی عناصر سے مشروط ہے، فطرت کا تعلق باطن سے ہے۔

ہم خوشی کو فطری عمل کے بجائے ردعمل کے طور پر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ خوشی کسی عمل کے نتیجہ میں ملتی ہے جیسے ملازمت میں ترقی، شادی ہونا، من پسند شے اور نتائج کا حصول یا مالی حیثیت میں اضافہ ہونا۔ تجربہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ان چیزوں سے ملنے والی خوشی دھندلی یادداشت بن جاتی ہے کیوں کہ یہ عمل نہیں، ردعمل کے طور پر ملی ہے۔اور یہ خوشی نہیں، خوشی کے پردہ میں دکھ اور تکلیف ہے جس کے لئے شاعر نے کہا ہے،

ہر خوشی اک وقفۂ تیاری سامان غم
ہر سکوں مہلت برائے امتحان و اضطراب

''عمل'' میں خوشی پہلے ہے پھر دوسرے نتائج حاصل ہوتے ہیں جب کہ ''ردعمل'' میں دیگر عوامل کو اولیت اور خوشی کو ان کے نتائج سے منسلک کرکے ثانوی حیثیت دی جاتی ہے۔ پہلا طریقہ پائیدار اور دوسرا ناپائیدار ہے۔خوشی کو بنیاد بناکر کام کیا جائے تو غیر مشروط خوشی حاصل ہوتی ہے کیوں کہ ذہن نتیجہ سے بے پروا ہوجاتا ہے۔ یہ مسرت ماند نہیں ہوتی، ہمیشہ ساتھ رہتی ہے۔ بیرونی عناصر اس جذبہ کو کم یا زیادہ نہیں کرسکتے بلکہ غیر مشروط مسرت بیرونی عناصر پر محیط ہوجاتی ہے اور فرد ہر شے کو اندر کی آنکھ سے دیکھتا اور سکون محسوس کرتا ہے۔فہم کا دائرہ وسیع ہونے سے خوشی جذب کرنے والی شے کے طور پر سامنے آتی ہے جو ہر شے میں جذب ہورہی ہے اور ہر شے کو اپنے اندر جذب کررہی ہے۔

فطرت میں موجود خوشی کو سمجھا جائے تو معاشرہ میں

رائج خوشی کی عمومی تعریف غیر اہم ہو جاتی ہے کیوں کہ یہ توقعات ، لالچ اور تکلیف کی پیداوار ہے جو ہمیں عدم استحکام میں مبتلا کرتی ہے۔ جو لوگ دنیا کی زندگی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق ان کی زندگی میں سے سکون نکل جاتا ہے۔ مال اور اولاد کی محبت فتنہ بن جاتی ہے۔

دستاویزی فلم ''دا سیکرٹ'' بہت مشہور ہوئی۔ یہ کشش کے قانون پر مبنی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ خیالات ہماری زندگی پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ بعد میں اس پر کتاب بھی لکھی گئی جس کا 50 زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ دستاویزی فلم میں بتایا گیا ہے کہ آپ جس شے کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس کی تکرار شروع کر دیں، وہ شے کائنات میں جہاں ہے، آپ کی طرف کھچی چلی آتی ہے۔ البتہ فلم میں جن خواہشات کی عکس بندی کی گئی ہے، ان میں تقریباً سب مادی ہیں۔ بلاشبہ شے کے حصول میں کشش اور تکرار کا قانون اہم ہے لیکن جن چیزوں کی ہم تکرار کرتے ہیں وہ تغیر پذیر ہیں۔ تغیر کی حامل شے مستقل خوشی کیسے دے سکتی ہے ــــ؟

ہم خوش رہنا چاہتے ہیں اور خوشی کے پردہ میں ناخوشی اپناتے ہیں۔ ایسا معاشرہ جس کی بنیاد خوشی کا تعاقب کرنا ہو، کیا وہاں کوئی فرد سچی خوشی سے واقف ہو سکتا ہے ــــ؟ خوشی تو فطرت میں موجود ہے پھر تعاقب کرنا کیا ہے؟

ہم خوشی سے واقف نہیں اور ناخوشی کو خوشی سمجھتے ہیں۔ ناخوشی وہ لبادہ ہے جس کے تار فرد کے اغراض سے بُنے ہوئے ہیں۔ جب تک مطلب حاصل ہو رہا ہے، وہ شے اچھی ہے، مطلب ختم، شے کی اہمیت ختم! جس کو ہم خوشی کہتے ہیں، وہ ہماری غرض ہے۔ خواہشات رکھنا غلط نہیں ہے، خواہشات میں خود غرضی شامل ہونا غلط ہے۔

سمجھنا بہت اہم ہے کہ ہم خوشی کو عمل نہیں، ردعمل کے ذریعے حاصل کرتے ہیں۔ جب کہ خوشی عمل اور ناخوشی ردعمل ہے۔ عمل یہ ہے کہ قدرت کی طرف سے جو شے ملتی ہے اسے قبول کریں، اس سے قدرت کا عمل فرد کی رضا بن جاتا ہے۔

قدسی نفس خواتین وحضرات کے لئے ارشاد ہے،

''میں اپنے بندوں کو دوست رکھتا ہوں اور ان کے کان، آنکھ اور زبان بن جاتا ہوں۔ پھر وہ میرے ذریعے سنتے ہیں، میرے ذریعے دیکھتے ہیں اور میرے ذریعے چیزیں پکڑتے ہیں۔''

حقیقی خوشی سے واقف ہونے کے لئے ہمیں مسئلہ کی بنیاد تک پہنچنا ہوگا یعنی ہماری سوچ، جس کے تحت ہم حالات اور چیزوں کو دیکھتے ہیں۔

زندگی خواہشات پر نہیں گزرتی، اس کے اپنے مدارج اور تقاضے ہیں جس سے گزرنے کا ہر فرد پابند ہے۔ کوئی

بوڑھا ہونا نہیں چاہتا لیکن بوڑھا ہو جاتا ہے۔ بڑھاپے کو ضعیفی سمجھا جاتا ہے جب کہ ہمارے سامنے ایسی مثالیں ہیں کہ جو لوگ اللہ کی محبت میں، خدمت خلق یا کسی تعمیری مقصد کے تحت زندگی گزارتے ہیں، وہ بوڑھے ہو جاتے ہیں، ضعیف نہیں ہوتے۔ ضعف دراصل ارادہ کی کم زوری ہے۔ ذہن تھک جائے تو جسم تھک جاتا ہے۔ اگر روح سرشار ہو تو جسم کی تھکن کے باوجود آدمی توانا اور جوان رہتا ہے۔

ادوار کے لحاظ سے دیکھا جائے تو آدمی عمومی طور پر خوشی کو بچپن اور جوانی سے منسوب کرتا ہے۔ یہ تنگ نظری ہے۔ ہم غیر فطری اصولوں پر زندگی گزارتے ہیں اس لئے بڑھاپے میں ضعیف ہو جاتے ہیں۔ بڑھاپے میں بھی وہی روح فرد کے اندر موجود ہے جو جوانی اور بچپن میں ہے۔ ایسے لوگ ہیں جو بڑھاپے میں جوانوں سے زیادہ کام کرتے ہیں۔ دراصل ہم فطرت کے برخلاف اصولوں پر عمل کر کے جسم کو نقصان پہنچاتے ہیں لیکن اپنے عمل کو برا سمجھنے کے بجائے بڑھاپے کو برا کہتے ہیں۔ لہٰذا خوشی کے لئے سوچ بدلنے اور چیزوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

گہرائی میں دیکھنے سے فہم میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ شے اندر، باہر، ظاہر اور باطن پر مشتمل ہے۔ صرف ظاہر دیکھ کر کیسے قیاس کر لیا جائے کہ وہ کیا ہے ــــ؟ اندر دیکھنے سے باہر دیکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ کیا سمندر صرف سطح کا نام ہے ــــ؟ سمندر کے باطن میں ایک دنیا آباد ہے۔ اندر جانے والا پانی کو پھر الگ نظر سے دیکھتا ہے کیوں کہ پانی میں جب تک خدوخال ظاہر نہ ہوں، ڈائی مینشن مغلوب رہتی ہے۔ حقیقی خوشی اندر میں دیکھنا ہے، یہاں سے زندگی نیا موڑ لیتی ہے۔

موجودہ دور میں غیر مشروط خوشی کا تصور ناپید ہے کیوں کہ خوشی کو ردعمل سے جوڑا جاتا ہے جو زیادہ تر مادی یا معاشرتی مفاد سے متعلق ہوتا ہے۔

میں خوشی کو ویسے ڈھونڈتی تھی جیسے اردگرد موجود لوگ ڈھونڈتے ہیں یعنی مادی اشیا میں۔ البتہ کیسا ہی بہترین لباس پہنا، شان دار اور لذیذ کھانا کھایا یا کوئی کام یابی ملی، میرے اندر کمی اور کسی شے سے دوری کا احساس موجود تھا۔ تلاش نے راستہ دکھایا کہ میں اپنے اندر اطمینان بڑھا کر اس کمی کو دور کر سکتی ہوں۔

غم سے غم ہو نہ خوشی سے ہو خوشی کا احساس
ایسی تدبیر بھی اے دل کوئی کر دی جائے
تب کہیں جا کے ملے منزل عرفاں کا نشاں
جب نگاہوں کو زباں دل کو نظر دی جائے

ادھورے پن کا احساس انوکھا نہیں، سب اس سے گزرتے ہیں اور گزر رہے ہیں مگر وجوہات پر غور نہیں کرتے۔ ٹیکنالوجی میں جدت آنے سے دنیا سمٹ رہی ہے لیکن ہماری سوچ منتشر ہو رہی ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ ٹیکنالوجی میں جدت کے ساتھ ہمارے ذہن کی اسپیس بھی وسیع ہو، اس کے برعکس یہ روز بروز تقسیم ہو

رہی ہے۔ذہن کی اسپیس پر بنجر زمین کی مانند جگہ جگہ دراڑیں آ گئی ہیں ، پانی خشک ہو رہا ہے، پلیٹوں کی حرکت تیز ہوگئی ہے اور سطح کھل رہی ہے۔زمین ذہن کی ہو یا فرش کی— سیرابی کی ضرورت ہے اور سیرابی کا انحصار آسمان سے نازل ہونے والے پانی یعنی لاشعور کی اطلاع کو قبول کرنے پر ہے۔

ایک شخص سکون حاصل کرنے خانقاہ میں داخل ہوا۔ جانے کا وقت آیا تو خود کو پہلے سے بہتر، پُر سکون اور مطمئن پایا مگر دل میں انجانی خلش موجود تھی۔

درویش نے کہا کہ تم چاہو تو جانے سے پہلے اپنی کیفیت کے بارے میں کسی سے بات کر سکتے ہو۔

اس شخص نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا، میں نے یہاں آپ سے بہتر کوئی طالب علم نہیں دیکھا۔آپ استاد ہیں لیکن علم کی طلب میں مشغول رہتے ہیں۔ جانے سے پہلے میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ سکون کیسے حاصل کرتے ہیں؟

درویش نے کہا، میں yes (ہاں) کہتا ہوں۔جو حالات پیش آتے ہیں، میں ہمیشہ ''ہاں'' کہتا ہوں۔

اس شخص نے درویش کی آنکھوں میں غور سے اپنا عکس دیکھا اور سلام کر کے وہاں سے رخصت ہوا۔ اسے پُر سکون رہنے کا قانون سمجھ میں آ گیا تھا۔

اولیاء اللہ خواتین میں سے ایک بی بی فاطمہ بنت المثنیٰؒ ہیں۔وہ فرماتی ہیں،

''لوگ اللہ کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اور روتے پھرتے ہیں۔اللہ کی قربت اور محبت یہ ہے کہ وہ جس حال میں رکھے، بندہ خوش رہے۔''

قدرت کی طرف سے ہمارے لئے جو مقرر ہے، بیش تر تکالیف اور زیادہ تر مصائب اس پر مزاحمت سے آتے ہیں۔ہم زندگی سے لڑتے ہیں جب کہ زندگی ہماری دوست ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

''ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں ابھرنے والے وسوسوں کو ہم جانتے ہیں۔ہم اس کی رگِ جاں سے زیادہ اس سے قریب ہیں۔'' (ق:۱۶)

زندگی ہمیں جو کچھ پیش کرتی ہے، اگر ہمیں پسند نہیں تو ہم رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں نتیجہ میں تکلیف سے گزرتے ہیں۔ جب ہم زندگی کو ''ہاں'' کہنا سیکھ لیں گے، خود کو قدرت کی رضا کے سپرد کریں گے اور کہیں گے کہ ٹھیک ہے، ان حالات میں میرا رویہ کیا ہونا چاہئے تو یہ وہ مرحلہ ہے جب ہمیں اپنی سکت کا ادراک ہوتا ہے۔

خوشی کا راز راستہ کے مناظر قبول کرنے میں ہے۔ موسم خراب ہے، آپ اسے مسترد کر کے ذہن کو بوجھل کر سکتے ہیں، موسم کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔موسم سے لڑیں نہیں، قبول کر لیں۔ زندگی رواں رہنے والی شے ہے، اس کو روکنے کی کوشش مت کریں۔مزاحمت سے تکلیف آپ کو ہوگی، زندگی جاری رہے گی۔

عثمان طاہر

حسرتوں کی سرخی

عورتیں گرد و پیش میں حالات کی مناسبت سے لغت ترتیب دیتی ہیں۔ بایں سبب جزئیات کو پیش کرنے کے لئے ان کے پاس الفاظ کی کمی نہیں ہوتی کیوں کہ ان کی زبان میں وضاحت زیادہ ہے اسی لئے عورتوں کی تحریروں میں شائستگی ہوتی ہے۔

ایک دن مرزا رفیع سوداؔ کے ہاں میر سوزؔ تشریف لائے۔ باتوں کے دوران مرزا سوداؔ نے شیخ علی حزیں کی غزل کا مطلع پڑھا،

می گرفتیم بجاناں سرِ راہے گاہے
اُو ہم از لطفِ نہاں داشت نگاہے گاہے

ترجمہ: کبھی محبوب سے سرِ راہ ملاقات ہو جاتی تھی وہ بھی لطفِ باطن سے ہم پر نگاہ ڈال لیتا تھا۔

جواب میں میر سوزؔ نے اپنا مطلع پڑھا۔

نہیں نکسے ہے مرے دل کی اُپاہے گاہے
اے فلک بہرِ خدا رخصتِ آہے گاہے

ترجمہ: میرے دل کا ارمان پورا نہیں ہوتا۔ اے آسمان! اللہ کے واسطے ایک آہ بھرنے کی اجازت دے دو۔

مرزا سوداؔ نے کہا، میر صاحب! بچپن میں ہمارے ہاں مغنّیائیں آتی تھیں، اس وقت یہ لفظ (اُپاہے) سنا تھا اور آج سنا ہے۔ میر سوزؔ ہنس کر چپ ہو گئے۔

وہ مغنّیائیں جو ''نکسے'' اور ''اُپاہے'' جیسے الفاظ بولتی تھیں، فارسی غزلوں کے بجائے ہندی اشعار سناتی تھیں۔ یہ زبان ان دنوں بآسانی سمجھ میں آنے والی اور مقبول عام تھی۔

اردو بات چیت کی زبان بنی تو اس نے ادبی زبان اور بول چال کے فرق کو مٹایا۔ عوام و خواص دونوں ادبی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ اٹھارویں صدی میں بیش تر دہلوی شعرا کے کلام میں یہی اصول جھلکتا ہے۔ آگے چل کر جب مرزا مظہرؔ جانجاناں، حاتمؔ، سوداؔ، ناسخؔ، شاہ نصیرؔ اور ذوقؔ نے اپنے مزاج کے مطابق زبان کی اصلاح کا کام کیا تو دہلی میں جس قدیم لب و لہجہ کی گونج سنائی دی، اس کا سہرا مردوں سے زیادہ خواتین کے سر ہے۔

جو خواتین زیادہ وقت گھر میں گزارتی ہیں، ان کا مختلف اقوام اور زبان کے لوگوں سے ملنا جلنا کم ہوتا

ہے اس لئے کہنا بجا ہے کہ ایسی خواتین زبان کے معاملہ میں قدامت پسند ہوتی تھیں۔موجودہ دور میں نانی دادی اوران کی تربیت میں رہنے والے بچوں کی زبان سنیں، لہجہ خالص اور زبان میں ادب ہوتا ہے۔ پہلے کے وقتوں میں خواتین کا اپنی برادری سے باہر کے لوگوں اور قسم قسم کی بولی بولنے والوں سے مکالمہ نہ ہونے کے برابر تھا لہٰذا اس زمانہ میں خواتین کی زبان بگڑنے سے محفوظ رہتی تھی۔

الفاظ کے انتخاب میں خواتین کی خصوصیت ہے کہ وہ مردوں کے مقابلہ میں شائستہ اورلطیف زبان استعمال کرتی ہیں۔نیز بعض ایسی باتیں جن کا سرعام اظہار اچھا نہیں سمجھا جاتا، انہیں واضح الفاظ میں کہنے کے بجائے اشاروں کنایوں میں بیان کرتی ہیں جس سے اخلاقی ماحول پروان چڑھتا ہے اورادب برقرار رہتا ہے۔

خواتین گردوپیش میں حالات کی مناسبت سے لغت ترتیب دیتی ہیں۔بایں سبب جزئیات کو پیش کرنے کے لئے الفاظ کی کمی نہیں ہوتی کیوں کہ ان کی زبان میں وضاحت زیادہ ہے اسی لئے خواتین کی تحریروں میں شائستگی ہوتی ہے۔

حضرات اتفاق کریں گے کہ خواتین لسانی اعتبار سے مردوں سے تیز ہوتی ہیں اور مقابل کو ہتھیاروں کے بغیر الفاظ کے وار سے مات دینے کی زبردست صلاحیت رکھتی ہیں۔اور جناب! ''خاص'' مواقع پر ان کے لہجہ میں فصاحت وصراحت کے کیا کہنے! ان کی بلاغت سے پتھر میں چنگاری پیدا ہوجاتی ہے۔تجربہ کار حضرات تحریر میں مخفی مفہوم سے واقف ہیں۔

البتہ اس میں شک نہیں کہ زبان میں تیزی، ذہن کی تیزی کو ظاہر کرتی ہے اس لئے ہر لحاظ سے خواتین صلاحیت میں مردوں سے آگے ہیں۔جس کام میں پیش قدمی کرتی ہیں، توجہ اور سلیقہ سے انجام دیتی ہیں۔سیکھنے کا شوق رکھتی ہیں اور ذوق میں نزاکت مدنظر ہوتی ہے۔

خواتین کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ باتونی ہیں۔وجہ یہ ہے کہ اظہار بیاں کا شوق انہیں گفتگو پر مائل رکھتا ہے۔دوسری وجہ مردوں کے صبر کا امتحان لینا اور انہیں اچھا سامع بنانا مقصود ہے۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ گاؤں دیہات جہاں خواتین گھر کے ساتھ باہر کے امور بھی انجام دیتی ہیں اور حضرات کام نہیں کرتے، سارا دن محفلیں جماتے اور پلنگ توڑتے ہیں — یہاں تک کہ باتوں میں خواتین کو مات دے دیتے ہیں۔لہٰذا باتونی ہونے کی ایک وجہ فارغ بیٹھنا ہے۔لیکن خواتین پر یہ قانون لاگو نہیں ہوتا — دن بھر کام کاج اور گھر کی مشکل ذمہ داری کے باوجود بلاغت کے فن میں ان کا ثانی نہیں۔

مزاح ایک طرف — اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ زبان کے سلسلہ میں مردوں سے زیادہ خواتین ماہر ہیں۔انہیں الفاظ ٹٹولنے اور تولنے میں دیر نہیں لگتی۔ مشکل سے مشکل بات کو آسان الفاظ میں بیان کردیتی

ہیں—اور یہ خوبی ہے۔

ہر زبان کی لغت میں ایسے الفاظ ہیں جو خواتین کی بول چال کے لئے مخصوص ہیں اور مردوں کی گفتگو میں یہ الفاظ کم نظر آتے ہیں۔ زبان کے حوالہ سے دہلی اور لکھنؤ کی خواتین کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ بیش تر محاورے اور اصطلاحات کی ایجاد ان سے منسوب کی جاتی ہے۔ اردو نثر میں خواتین کی بول چال ''باغ و بہار'' اور دیگر داستانوں میں سمٹ آئی ہے۔ ایک اور مثال لکھنؤ کے آخری نواب واجد علی شاہ کی بیگمات کے خطوط ہیں جو انہوں نے شوہر کو مٹیا برج جانے کے بعد لکھے۔

مٹیا برج میں اسیری کے دوران نواب واجد علی شاہ نے بیگمات کو متعدد خطوط لکھے اور بیگمات نے بھی غم و یاس اور فراق کا اظہار سلیس اور شستہ زبان میں کیا۔ جو عکاسی کرتا ہے کہ اس دور میں عام بول چال کی زبان ادبی تھی۔ واجد علی شاہ کی پڑھی لکھی بیگمات کے علاوہ وہ بیگمات جو پڑھی لکھی نہیں تھیں، باقاعدگی سے منشیوں، ادیبوں اور شاعروں کے ذریعہ خطوط لکھواتی تھیں۔

اس بارے میں مصنف خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں،

''عورتیں زبان کی سب سے بڑی محافظ ہوتی ہیں۔ اور اردو کی ٹکسالی زبان کا تو دارومدار صرف بیگمات پر ہے۔ واجد علی شاہ کی بیگمات کو اس معاملہ میں خصوصیت حاصل ہے۔''

یہ خطوط مفلسی و پریشانی میں لکھے گئے تھے لیکن ان میں روزمرہ کی چاشنی، الفاظ کی ترتیب، محاورات کا استعمال، سادگی غرض زبان کی تمام خوبیاں ملتی ہیں۔

جب واجد علی شاہ کو وطن سے دربدر کیا گیا تو اس وقت کی روداد نواب خاص محل کے ایک خط سے ہوتی ہے جو انہوں نے نواب کی دوسری بیگم شیدا کو لکھا۔

''بہن شیدا بیگم! میراں جی کی 27 تاریخ 1217ء پنج شنبہ کا دن عمر بھر نہ بھولے گا جب کہ سلطان عالم کو جنرل اوٹرم صاحب نے باپ دادا کی سلطنت چھوڑنے اور حکومت سے دست بردار ہونے کا حکم دیا اور لکھنؤ سے ہم جدا ہوئے جیسے بلبل گلزار سے چھوٹی، یوسفؑ مصر سے نکلے، بوئے گل چمن سے جدا ہوئی۔ پیا جان عالم کو سکوت اور تمام عملہ کا حسرت بھری نگاہ سے دیکھ کر بے کسی کے آنسو بہانا۔ کمال ادب سے رومال میں غم کے موتیوں کو سمونا۔ اعزا کو ہچکیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہم آخرش محلات میں ماتم بپا کرتے ہوئے سلطان عالم کے ہم راہ روانہ ہوئے۔ اس وقت جان عالم کا یہ کہنا، تم پر دس برس تک میں نے سلطنت کی، اس عرصہ میں جو کچھ صدمہ اور رنج میری ذات سے تم کو پہنچا ہو اس کو بخوشی معاف کردو۔ اس وقت میں معزول ہوں اور تم سے چھٹتا ہوں۔ خدا جانے زندگی میں پھر ملوں یا نہ ملوں۔''

قارئین! خط کیا ہے، غم و یاس کی تصویر ہے جس میں حسرتوں کی سرخی ملی ہوئی ہے۔ اس دور کی نثر پر بھی شاعری کا گمان ہوتا ہے۔ شیدا بیگم کا خط پڑھئے جو انہوں نے نواب واجد علی شاہ کو لکھا،

''مجمع جود وکرم، صاحب سیف وحلم، حضرت سلطان عالم زید اللہ عشقہ۔ بڑا ہے یہ ظلم وستم کہ تم نے محبت نامہ نہ کیا رقم، سچ کہوں خدا کی قسم، کیوں ہوگئے ہم سے برہم، ہم کو اس کا بہت ہے غم، کس نے الفت کی ہے کم، اپنا تو فرقت سے نکلتا ہے دم کہ خیریت سے لائے تم کو ربِ اکرم، پھر ہم تم ہوں باہم، اور نورِ چشم نگیں آرا بیگم تسلیم کرتی ہیں، ہو کرخم۔''

ان خطوط میں اوراقِ پارینہ کی جھلکیاں ہیں۔ طرز بیان میں سادگی اور صراحت پر نظر ڈالئے تو اشاروں کنایوں میں جذبات کا اظہار ہے۔

آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے عہد میں اردو زبان پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مصنف نے لکھا ہے،

''قلعہ معلیٰ کی تہذیب کا ایک اہم جز وہ زبان تھی جس میں شاہ عالم ثانی اور ان کے بعد ظفر نے بھرپور شاعری کی۔ اس زبان کی گونج قلعہ اور بازار سے گزرتی ہوئی کابلی دروازہ کے اس تنگ وتاریک مکان تک سنائی دیتی تھی جہاں ذوق کا مسکن تھا اور پھر یہ گونج سننے والوں کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ اس گونج میں ذوق بھی کھنچے چلے گئے اور پھر دلّی کا محاورہ اور روزمرہ جس طرح ذوق کی شاعری میں رچ بس گیا، اس کی دوسری اور نسبتاً زیادہ خوب صورت مثال داغ کے یہاں ملتی ہے۔''

زبان کے حسن کا دارومدار لہجہ میں نرمی اور روانی، آسان الفاظ اور گہرے معانی پر ہے۔ اس معیار میں کمی زبان کے زوال اور عدم مقبولیت کا سبب بنتی ہے۔ بیگمات نے اپنے محاوراتی اسلوب میں تشبیہ اور تمثیل، مصوری اور اشاریت کے جوہر سمو لئے تھے۔ اردوئے معلیٰ سے محبت کرنے والا ان کی صدائے بازگشت سن کر بے قرار ہو جاتا ہے۔

ضرب الامثال اور محاورہ بھی زبان کے لئے خزانہ ہے۔ مثلاً، جی جائے ـــ گھی نہ جائے۔

ایک گال ہنسنا ـــ ایک گال رونا۔

جھٹ پٹ کی گھانی ـــ آدھا تیل آدھا پانی۔

آئی تو نوش ـــ نہیں تو فراموش، وغیرہ۔

سنا ہے کوئی جاٹ سر پر چارپائی لئے کہیں جا رہا تھا۔ ایک تیلی نے دیکھ لیا اور جھٹ پھبتی کسی۔

جاٹ رے جاٹ تیرے سر پہ کھاٹ۔

جاٹ چپ رہا مگر بدلا لینے کا ارادہ کرلیا۔

ایک دن دیکھا کہ تیلی اپنا کولہو لئے جاتا ہے۔

جاٹ نے جواباً کہا، تیلی رے تیلی ترے سر پہ کولہو۔

تیلی ہنسا اور کہنے لگا، جچی نہیں۔ جاٹ نے جواب دیا جچے نہ جچے تو بوجھوں تو مرے گا۔

بچہ زبان ماں سے سیکھتا ہے۔ جب سے خواتین کی نوکری کا رجحان بڑھا ہے، زبان بھی متاثر ہوئی ہے۔ کہتے ہیں کہ جہاں خواتین ہوتی ہیں مرد الفاظ کے انتخاب میں احتیاط برتتے ہیں۔

میرا اپنا تجربہ ہے کہ جس آفس میں کام کرتا ہوں، پہلے وہاں سارے مرد کام کرتے تھے۔ پہلی بار خاتون کو رکھا گیا تو سب کو تاکید کی گئی کہ بات چیت میں احتیاط کریں، اب آفس میں ایک خاتون بھی ہیں۔ سب نے احتیاط اور ادب کو ملحوظ خاطر رکھا اور چند روز میں آفس کا ماحول بدل گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خاتون نے خود کو مردوں کے رنگ میں نہیں ڈھالا بلکہ خاموشی سے سب کا مزاج بدل دیا۔

اس کے برعکس جتنا خواتین کا گھر سے باہر کام کرنے کا تناسب بڑھ رہا ہے، زبان بھی تبدیل ہو رہی ہے۔ اخبار کے دفتر میں ایک خاتون کو نائٹ شفٹ میں ملازمت پر رکھا گیا تاکہ ماحول میں نظم و نسق پیدا ہو اور ملازمین کی زبان بہتر ہو۔ کچھ عرصہ بعد سب نے دیکھا کہ خاتون نے مردوں کی زبان کا اثر لے لیا۔ وجہ یہ ہے کہ ماحول میں مردوں نے خاتون کی موجودگی کا لحاظ نہیں کیا اور خاتون نے بھی ان کے ساتھ کام کرتے ہوئے زبان کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔

ہر دور میں زبان پر عروج و زوال آتا ہے۔ خالص زبان گھٹتے گھٹتے عامیانہ ہو جاتی ہے۔ غالبؔ اور میرؔ کی شاعری پڑھیں، اپنے زمانہ میں یہ اردو کا معیار تھا، اور آج کی زبان دیکھ لیں۔ فرق واضح ہے کہ کس حد تک الفاظ کا انتخاب اور معیار بدل گیا ہے۔

تہذیب کی حفاظت بنیادی طور پر عورت کے ہاتھ میں ہے کیوں کہ وہ مردوں کی تربیت کرتی ہے۔ زبان کی درستی کا حل یہ نہیں کہ عورتیں گھر پر بیٹھ جائیں لیکن جہاں رہیں، اپنے کردار کے ذریعے تربیت کا عمل ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

اب نہ وہ اردو رہی اور نہ عوام و خواص میں بولی جانے والی اس وقت کی زبان۔ بدلتے زمانہ اور جدید مواصلاتی نظام نے ماضی کی ریتی روایات بدل دی ہیں۔ عورت مرد سب اردو بول رہے ہیں لیکن نہیں بول رہے۔ جو لوگ زبان کے حسن کا رونا روتے تھے، وہ قصۂ پارینہ ہوئے۔ جو اب موجود ہیں وہ کل نہیں ہوں گے — ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا نام اللہ کا!

نقار خانہ میں طُوطی کی آواز

شور شرابا کرنے والے زیادہ ہوں تو اچھی بات بھی سنی ان سنی ہو جاتی ہے، اسے نقار خانہ میں طُوطی کی آواز کہتے ہیں۔ یہ محاورہ ان معنوں میں بھی بولا جاتا ہے کہ اگر ایک شخص سماجی لحاظ سے کم زور ہے تو اس کی بات کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ گزرے وقتوں میں شاہی محلات میں نقار خانہ ہوتا تھا، اور دن میں کئی بار نقارے (نوبت) بجتے تھے۔ خوشی کے موقع پر سلطنت میں ڈھول بجانا دستور تھا۔ جب نوبت بجتی تھی تو کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اسی سے مشہور ہوا کہ نقار خانہ میں طُوطی کی آواز کون سنتا ہے۔

پڑھ رہے تھے وہ شبنم سے کر کے وضو
اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو

اللہ تعالیٰ نے مخلوق میں نظام قائم کیا ہے کہ ایک لباس مغلوب ہوتا ہے، دوسرا لباس غالب ہو جاتا ہے۔ دل کہتا ہے کہ تلاش کرو کسے چھپایا جا رہا ہے، کون ہے جو انجانی دنیا سے حسین سے حسین تر لباس میں آتا ہے اور نہ جانے کہاں چلا جاتا ہے۔

گھر میں پودے اگانے کا خیال آیا۔ خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے نرسری گئی۔ نگاہ سرخ رنگ کے جاذب نظر لیبل پر پڑی جو ہرے بھرے پتّوں کے بیچ ٹماٹروں کی تصویر کے ساتھ کسی پیکٹ پر بہت سج رہا تھا۔ لیبل پر لال رنگ کے خوب صورت ٹماٹروں نے سبز پتّوں پر ایسا رنگ جمایا جیسے سرخ جوڑے میں ملبوس دلہن سبز رنگ کی سیج پر بیٹھی ہو۔ دل نے فیصلہ سنایا کہ گھر میں ٹماٹر اگائے جائیں۔

نرسری میں چھ چھوٹے گملوں میں ٹماٹر کے بیج فروخت کے لئے پہلے سے مٹی میں ڈال دیئے گئے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ بیج کے راز کو راز رکھنے کے لئے مٹی پردہ بن گئی ہے۔ قدرت کا عجب نظام ہے کہ بیج مٹی میں پیدا ہوتا ہے، مٹی میں اس کی پرتیں کھلتی ہیں اور رنگوں کی بوقلمونی کے بعد بیج مٹی کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ بیج کے اپنے رنگ کہاں ہیں؟

گملے خریدنے کے بعد گھر آ کر باورچی خانہ کی کھڑکی میں رکھے۔ کھڑکی کافی بڑی اور پوری شیشہ کی ہے۔

مجھے تجربات کا شوق ہے۔ اس سے پہلے میں نے گھر میں کوئی شے نہیں اگائی۔ پہلا تجربہ تھا اس لئے میں بے حد پُرجوش تھی کہ پہلی بار کسی پودے کو روز بروز بڑھتا ہوا دیکھوں گی۔ دل انجانی خوشی سے سرشار تھا۔ ممکن ہے خوشی اس بات کی تھی کہ یہ تجربہ ذہن کے دریچے کھولے گا اور بیج کھلنے کے ساتھ زندگی کی پرتیں بھی کھلیں گی۔

کھڑکی پر سفید جالی دار نفیس پردوں کے درمیان رکھے چھ گملے میری توجہ اور محبت کا مرکز بن گئے۔ صبح سب سے پہلے گملوں میں مٹی دیکھنا، اندر محو استراحت لیکن خاموشی سے حرکت کرتے ہوئے بیجوں سے محبت بھری باتیں کرنا اور پانی دینا معمول بن گیا۔

آس اور امید کا ایک پودا میرے اندر اگ گیا تھا جو گملوں میں موجود پودوں کی افزائش کا منتظر تھا۔

میں پودوں سے پودوں کی زبان میں بات کرنا چاہتی تھی — اور اپنے اندر پودے کی کیفیات محسوس کئے بغیر یہ ممکن نہیں۔ایک روز مٹی کے درمیان دبے ہوئے بیج کو تصور کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی کہ قرآن کریم کی آیت ذہن میں آئی۔

''کون موت سے زندگی اور زندگی سے موت کو نکالتا ہے اور کون امر کی تدبیر کرتا ہے؟'' (یونس:۳۱)

اللہ تعالیٰ نے مخلوق میں نظام قائم کیا ہے کہ ایک لباس مغلوب ہوتا ہے ،دوسرا لباس غالب ہوجاتا ہے۔ دل کہتا ہے کہ تلاش کرو کسے چھپایا جارہا ہے، کون ہے جو انجانی دنیا سے حسین سے حسین تر لباس میں آتا ہے اور نہ جانے کہاں چلا جاتا ہے۔ بظاہر بے حرکت نظر آنے والی شے کے اندر تخلیق کے کتنے رازخوابیدہ ہیں۔

گملوں کو صبح وشام نگاہِ شوق سے دیکھتی ۔غائب کو ظاہر اور ظاہر کو غیب میں دیکھنے کی جستجو نے مجھے بے قرار کردیا۔میری خوشی ، بے قراری اور پودوں سے انسیت کا جذبہ انہونا نہیں — ایک اللہ والے سے لو لگی، اس نے دل میں اللہ کی محبت کی شمع روشن کی اور زندگی کو قریب سے دیکھنا سکھایا — ہر شے میں قدرت کی صناعی کی طرف متوجہ کیا اور معرفت کے لئے بے قرار کردیا۔ اب پروانہ دن رات اس جستجو میں ہے کہ شمع سے جا ملے اور روشن ہوکر روشنی پھیلائے۔

ایک خوب صورت صبح حسب معمول گملوں کے پاس گئی — خوشی کی لہر دل ودماغ پر چھا گئی۔دو گملوں میں مٹی کی کوکھ سے دو ننھی منی نازک کونپلیں نمودار ہوچکی تھیں۔ بیج فنا ہوا لیکن پودے کی شکل میں موجود رہا۔ قدرت کی صناعی کا حسین شاہ کار — بیج کھل گیا تھا اور بظاہر نازک لیکن مضبوط پودا بننے کے لئے تیار ننھا تنا سر پر دو پتّے سجائے امید سحر کا پیغام دے رہا تھا۔کیا بیج میں سے پودے کا نکلنا عجوبہ نہیں — ؟

میں نے دیکھا کہ گملے میں مٹی ماں کا بطن تھی اور قدرت نے ماں کے پیٹ میں کیسی کیسی تصویریں بنا دیں! یہ صورتیں ظاہر ہونے سے پہلے کتنے مراحل طے کرتی ہیں۔ایک کے بعد ایک تغیر سے گزرتی ہیں۔ ہر مرحلہ جانتا ہے کہ یہ مرحلہ بھی گزر جائے گا — ہم ظاہر ہوکر غیب اور غیب میں سے پھر ظاہر ہوں گے، حرکت جاری رہے گی — جب تک زندگی، زندگی سے واقف نہیں ہوجاتی، بیج مٹی کے گملے میں ہو یا ماں کے رحم میں ، بوقلمونی جاری رہے گی۔ اور یہ ساری کوشش علمِ حقیقت کی معرفت کے لئے ہے۔

بیج نے مٹی کی ممتا، سورج کی روشنی میں موجود حسین رنگ، توانائی میں تمازت ، پانی کی ٹھنڈک اور ٹھنڈک میں موجود قدرت کی نعمتیں، ہوا کی لوریاں اور محبت کی لہریں قبول کیں۔وسائل کے استعمال اور ان وسائل سے تعاون کر کے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے ننھا

بیج پودے کی صورت میں زندگی پر نازاں تھا۔

خیال نے سرگوشی کی کہ اللہ تعالیٰ کی چاہت دیکھو اگر بیج قدرت کے فراہم کردہ وسائل سے فائدہ نہ اٹھاتا پھر بھی نعمتیں خدمت پر مامور ہیں۔ بیج کا وجود خالق کی چاہت کا اظہار ہے ورنہ وہ غیب سے ظاہر نہ ہوتا۔

ٹھنڈک کے احساس سے لبریز سبز پتّوں سے سجے پودوں کو گملوں سے زمین پر منتقل کیا کیوں کہ وہ کافی بڑے ہوگئے تھے۔ پانچ گملوں میں بیج دارِفانی میں ظاہر ہو چکے تھے مگر چھٹے گملے پر خاموشی طاری تھی۔ گہرا سکوت تھا جس نے ذہن میں سوالات پیدا کردیئے۔

چھٹے گملے سے پودا نمودار کیوں نہیں ہوا؟

کیا وہ ناقص بیج تھا اور کیا بیج ناقص ہوتا ہے؟

کیا بیج نے وسائل سے بے توجہی برتی ہے؟

باقی بیجوں کی طرح اس نے محبت کی لہروں، ہوا، پانی، روشنی اور مٹی سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا؟

کہیں وہ فنا اور تغیر سے خوف زدہ تو نہیں؟

فنا و بقا سے لاعلمی بھی وجہ ہوسکتی ہے لیکن بیج تو فنا سے واقف ہے۔ یا بیج اس زون میں داخل نہیں ہونا چاہتا جہاں وہ بیج کے بجائے پودا کہلاتا!

بیج خاموش رہا، میں نے بھی بھلا دیا اور توجہ باقی پانچ گملوں پر مرکوز کردی۔ بعد میں احساس ہوا کہ چھٹے بیج کے نہ کھلنے پر غور کرتی تو بیج ضرور اپنی خاموشی توڑتا اور مجھے بتاتا کہ وہ پودا کیوں نہیں بنا۔

پودوں کے ساتھ وقت گزارنا بہت اچھا لگتا تھا۔ دل میں ان کے لئے عجیب سی محبت اور خوشی کے ملے جلے جذبات تھے۔ میں نے ان سے باتیں کیں اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اور یہ سلسلہ اس وقت سے ہے جب سے میں ان کو گھر لائی تھی۔

اب آنکھیں پودوں پر پھل دیکھنے کی مشتاق تھیں۔ یہ خواہش بھی پوری ہوئی۔ ایک دن پانی دیتے وقت پتّوں کے نیچے چھپے گول مٹول سبز رنگ ٹماٹروں پر نظر پڑی۔ کہنے کو وہ ٹماٹر تھے اور ساری دنیا کے لئے پھل لیکن میرا تعلق ان سے ایسا تھا جیسے ماں کا بچوں سے ہوتا ہے۔ فرط جذبات سے اللہ کا شکر ادا کیا۔

کچھ پودوں پر پھل آچکے تھے، باقی پر انتظار کا سماں تھا۔ مجھے بے پھل پودوں کی فکر لاحق ہوئی۔ ان کو دیکھ کر میں سوچتی تھی کہ کیا ان کا بھی دل ہوتا ہے۔ میں انہیں دیکھتی ہوں، یہ بھی مجھے دیکھتے اور میرے جذبات محسوس کرتے ہوں گے۔ ان کی بھی زبان ہے۔ کیا یہ میرے جذبات و احساسات سے واقف ہیں۔ کیا یہ بھی میرے لئے ایسے جذبات رکھتے ہیں جیسے میں ان کے لئے رکھتی ہوں۔ وہ کون سا نظام ہے جو خاک میں سے رنگوں کو ظاہر کرتا ہے؟

خیالات کی یلغار بڑھتی گئی۔

پھر ایک حمد کے اشعار ذہن میں خیال بن کر اترے، زبان پر ورد بن کر فضا میں رس گھولنے لگے اور سماعت ان سے لطف اندوز ہوتی رہی۔

میں بوقتِ سحر جب چمن میں گیا
ٹہنیوں پر کھلے پھول تھے جابجا
گل کے پتّوں سے میں نے سنی یہ صدا
پڑھ رہے تھے وہ شبنم سے کرکے وضو
اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو
یہ زمین جب نہ تھی آسماں جب نہ تھا
کوئی یہاں جب نہ تھا کوئی وہاں جب نہ تھا
پڑھ رہے تھے وہ سب مل کے یہ روبرو
اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو
پوچھا بلبل سے میں نے کہ تو یہ بتا
کس کے رخسار گالوں پہ ہے تو فدا
کس کے غم میں ہے یہ تیری حالت بتا
بولی آنکھوں سے اپنے بہا کر لہو
اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو
عرض کی میں نے سنبل سے اے جستجو
صبح شبنم سے کرکے تو تازہ وضو
جھوم کر کون سا ذکر کرتی ہے تو
سن کے کرنے لگی دم بدم ذکر ھو
اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو

واقعی میں پودوں کے راز کو سمجھ نہیں پائی کیوں کہ میں اپنی زندگی کے راز سے ناواقف تھی۔

گیندنما سبز ٹماٹر پتّوں کی اوٹ سے مجھے مسکراتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ کچھ دنوں بعد سبز ٹماٹر سرخ لبادہ

> اچھے اعمال و خیالات خوش بو اور برے خیالات و اعمال بدبو کی طرح ہیں۔ ماحول میں خوش بو پھیلتی ہے، کوئی سونگھے یا نہ سونگھے، خوش بو آتی ہے۔ ماحول میں بدبو پھیلتی ہے، لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ اسی طرح اچھے اعمال کا عکس چہرہ پر پڑتا ہے، لوگ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ جب برے اعمال کا عکس چہرہ پر واضح ہوتا ہے تو لوگ اسے دیکھ کر پراگندہ خاطر ہوتے ہیں۔ ہر آدمی کا چہرہ اس کا انڈیکس ہے۔

اوڑھ کر ایثار کے جذبہ سے سرشار ہماری غذا بننے کے لئے تیار تھے۔ اپنے اندر توانائی کو نئے روپ میں ڈھالنے کے منتظر تھے۔ ان پودوں کے ساتھ ذہنی و روحانی بالیدگی کا سفر میں نے بھی طے کیا۔ ہمارے شب و روز ایک تھے۔ فرق یہ تھا کہ وہ ایثار سے واقف تھے اور میں ایثار کرنا سیکھ رہی تھی۔

خیالات کے اس سفر پر میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے اندر باہر زندگی کی طرف متوجہ کیا اور میری زندگی کے پودے کی دیکھ بھال کے لئے اپنے ایک مہربان دوست کو میرا راہ نما بنایا۔ اللہ کے دوست نے بتایا کہ زندگی اللہ سے محبت کا نام ہے۔ اللہ سے محبت کرنے والا اندھیروں سے نکل کر روشنی میں سفر کرتا ہے ــــ ابر رحمت اس پر سایہ کرتی ہے اور رحیم و کریم ہستی اللہ کی معرفت عطا ہوتی ہے۔

حامد ابراہیم

لوہا ــــ؟

قارئین! اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے قرآن کا سمجھنا آسان کر دیا ہے۔ اسی ضمن میں ان الفاظ کی مدد سے دوسری آیتیں تلاش کیجئے ــــ یعلمون، تعلمون، تعقلون، یذکرون، یتفکرون، یا اولی الالباب، اولی الابصار، فبای آلاء ربکما تکذبان، فھل من مدّکر۔ قرآن کریم کی آیت کا مفہوم ہے کہ جو لوگ ہماری صفات میں غور و فکر کرتے ہیں، ہم انہیں ضرور ہدایت دیں گے تا کہ ان پر تخلیق کے رموز ظاہر ہوں۔

حامد ابراہیم صاحب مصوری اور خطاطی سے وابستہ ہیں۔ ان کے مضامین تحقیق و تفکر سے بھرپور ہیں۔ مضمون غور سے پڑھئے تا کہ ذہن کی آبیاری ہو۔ (ادارہ)

اللہ رب العالمین فرماتے ہیں:

''اور ہم نے لوہا نازل کیا۔ اس میں شدید سختی اور لوگوں کے لئے فوائد ہیں۔'' (الحدید:۲۵)

لوہے کے خواص، اہمیت اور نوع انسانی کے لئے اس میں موجود فوائد کی نشان دہی قرآن کریم میں اختصار اور جامعیت کے ساتھ کی گئی ہے۔

لوہا قدیم زمانہ سے آدمی کے استعمال میں ہے۔ اس میں موجود متعدد خواص اور فوائد دریافت ہو چکے ہیں لیکن بہت کچھ منکشف ہونا باقی ہے۔

قارئین کرام! لوہا کثیر الاستعمال دھات ہونے کے علاوہ ایک عجوبہ ہے۔ وہ کیسے ــــ؟

لوہے کو بآسانی زنگ لگ جاتا ہے اس کے باوجود یہ دھات کرۂ ارض کی باقی تمام دھاتوں میں اہم ہے۔ اس کی طلب اور ضرورت سب سے زیادہ ہے۔ دیگر دھاتوں کی نسبت لوہے کی تخلیص (refining) 90 فی صد ہے۔ معمولی ملاوٹ سے پاک خالص لوہا نقرئی مائل سرمئی رنگ کی دھات ہے جس کی مخصوص چمک ہے۔ عام لوہے کے مقابلہ میں خالص لوہے میں سختی بہت کم ہے۔ عجیب بات ہے کہ لوہا اندر موجود سختی، مضبوطی اور دوسری گوناگوں خصوصیات کا اظہار کاربن، سلیکان، کرومیم اور درجنوں دھاتی یا غیر دھاتی عناصر کی معمولی مقدار سے کرتا ہے۔

خالص لوہے میں انتہائی معمولی مقدار میں (تقریباً دو فی صد) کاربن شامل ہو جائے تو حاصل شدہ مرکب

فولاد (steel) کہلاتا ہے۔فولاد کی کئی قسمیں ہیں جو کاربن سمیت دیگر عناصر سے مرکب ہوتی ہیں اور مختلف مقاصد کے لئے تیار کی جاتی ہیں۔اگر لوہے کے ساتھ شامل کئے جانے والے عناصر کی نسبت دو فی صد سے زیادہ ہو تو اس مرکب کو بھرت (alloy) کہتے ہیں۔

ایک مثال اسٹین لیس اسٹیل ہے جس میں لوہا تقریباً 88.3 فی صد، کرومیم 10.5 فی صد اور کاربن 1.2 فی صد کے تناسب سے شامل ہے۔ یہ مقداریں اسٹین لیس اسٹیل کی مختلف اقسام میں کم وبیش ہوسکتی ہیں۔

مثال سے وضاحت مقصود ہے کہ لوہے میں دوسرے دھاتی عناصر کو مخصوص درجۂ حرارت اور معین مقداروں میں شامل کرنے سے بے شمار خصوصیات کے فولاد اور بھرت بنائے جاتے ہیں۔کسی میں بے پناہ سختی اور کسی میں لچک زیادہ ہے۔کسی میں زنگ سے محفوظ رہنے کی صلاحیت ہے اور کسی میں درجۂ حرارت کے خلاف زبردست مزاحمت ہے یعنی وہ دیر سے پگھلتے ہیں۔

لوہے کی خصوصیات کثیر الجہت ہیں۔تقریباً تمام دھاتی عناصر کے خواص لوہے میں مجتمع نظر آتے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں لوہے کو بیان کیا گیا ہے وہاں اس سے مراد کائنات میں موجود تمام دھاتی مادہ ہے۔

محققین نے زمین کے ماحولیاتی نظام میں جن عناصر کو اب تک شناخت کیا ہے، ان کے بقول ان عناصر کی تعداد 94 ہے۔ان میں دھاتی اور غیر دھاتی ٹھوس، دھاتی اور غیر دھاتی مائع اور گیسی عناصر شامل ہیں۔

عناصر کے جدول (چارٹ) میں ہائیڈروجن گیس پہلا عنصر ہے جو ایٹمی اعتبار سے سادہ ترین اور سب سے ہلکا ہے جب کہ اس چارٹ میں یورینیم دھات 92 نمبر پر ہے۔

یورینیم کے مرکزہ (nucleus) میں پروٹان کی تعداد 92 اور نیوٹران 146 ہیں یعنی کل 238 نیوکلیائی ذرّات (پروٹان + نیوٹران) یورینیم کے مرکز میں موجود ہیں۔ یہ ذرّات مرکزہ میں رہ کر آپس میں انتہائی مضبوطی کے ساتھ پیوست ہیں۔اگر یورینیم کا مرکزہ (nucleus) قدرتی یا مصنوعی تاب کاری کی بنیاد پر ٹوٹ جائے تو جن دو عناصر کی تخلیق ہوتی ہے وہ وزن کے اعتبار سے مجموعی طور پر یورینیم سے ہلکے ہوں گے۔نتیجہ میں مادہ کا زیادہ تر حصہ توانائی میں تبدیل ہوجائے گا۔ یہی وہ توانائی ہے جو یورینیم پر مشتمل ایٹم بم، یا ایٹمی ری ایکٹر سے حاصل ہوتی ہے۔

یورینیم یا اس سے کم ایٹمی نمبر کے قدرتی تاب کار عناصر میں تاب کاری اس لئے ہے کہ ان کے ایٹمی مرکزوں میں ذرّات کی باہمی پیوستگی کم زور ہے۔چناں چہ یہ ایٹم قدرتی طور پر خاص عرصہ میں ٹوٹ کر دوسرے عناصر میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

اگر ہم چاہیں تو ان عناصر کو بھی توڑ سکتے ہیں جن میں تاب کاری نہیں ہے لیکن اس کے لئے کثیر مقدار میں

توانائی درکار ہے۔

جیسے جیسے ہم عناصر کے چارٹ میں کم وزن عناصر کی طرف آتے ہیں، ایٹموں کو توڑنے میں درکار توانائی کی مقدار بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جب لوہے کا نمبر آتا ہے تو اسے توڑنے کے لئے اتنی توانائی کی ضرورت پڑتی ہے جو جوہری بم سے حاصل ہونے والی توانائی سے زیادہ ہے۔ یعنی لوہے کے ایٹم کو توڑنے کے لئے زیادہ توانائی خرچ کرنا پڑتی ہے۔ نتیجہ میں اس سے کم توانائی خارج ہوتی ہے۔

لہٰذا اضافی توانائی کا حصول ممکن نہیں۔

جوہری انشقاق جسے ایٹموں کے توڑنے کا عمل کہتے ہیں، کے علاوہ جوہری فیوژن سے بھی کثیر مقدار میں توانائی حاصل ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ہائیڈروجن کے دو ایٹموں کے مراکز یک جان (fuse) ہو جائیں تو ہیلیم کا نسبتاً بھاری مرکز تخلیق پاتا ہے۔ اس عمل میں بھی بے پناہ توانائی خارج ہوتی ہے۔ ہلکے ایٹموں کا آپس میں یک جان ہوکر بھاری ایٹم تخلیق کرنا عمل ایتلاف (نیوکلیئر فیوژن) کہلاتا ہے۔

جیسے جیسے ہم بھاری عناصر کی طرف بڑھتے ہیں، فیوژن (عمل ایتلاف) سے حاصل ہونے والی توانائی کم ہوجاتی ہے۔ اسی طرح لوہے کے ایٹموں کو آپس میں یک جان کرنے کی صورت میں حاصل شدہ توانائی، خرچ شدہ توانائی سے کم ہوگی۔

یعنی دونوں طرح کے نیوکلیائی تعاملات (انشقاق اور ایتلاف) کی صورت میں لوہا ایسا عنصر ہے جس کے ایٹموں کو توڑنا یا آپس میں یک جان کر کے مزید بھاری عناصر بنانا سب سے مشکل ہے۔

لوہا واحد عنصر ہے جس کے ایٹموں کے مراکز میں موجود ذرّات (پروٹان + نیوٹران) آپس میں سب سے زیادہ مضبوطی سے جڑے ہیں۔ آسان الفاظ میں یوں سمجھئے کہ لوہے کے ایٹم باقی تمام عناصر کے ایٹموں سے زیادہ مضبوط اور قائم رہنے والے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ستاروں کی مدت حیات (عمر) کا اندازہ لوہے کی مقدار سے کیا جاتا ہے۔

ستاروں میں عمل ایتلاف (فیوژن) کے نتیجہ میں ہلکے عناصر بھاری میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ نتیجہ میں حاصل توانائی سے ستارہ کی روشنی اور حرارت برقرار رہتی ہے۔ لیکن جب ہلکے عناصر کا ایندھن ختم ہوتے ہوئے ایتلاف کے عمل میں لوہا بنتا ہے تو ستارہ کی بھٹی میں خرچ ہونے والی توانائی کی مقدار زیادہ اور حاصل شدہ توانائی کم ہو جاتی ہے — ستارہ کی بتدریج موت واقع ہو جاتی ہے۔ ستاروں کے حوالہ سے محققین کا یہ نظریہ اگرچہ مفروضہ سے زیادہ نہیں ہے، لیکن اس سے دھاتوں میں لوہے کے منفرد مقام کا اندازہ ہوتا ہے۔

لوہے کے حیاتیاتی خواص:

زمین پر موجود تقریباً تمام قسم کے جانوروں اور پودوں کی زندگی میں لوہے کا اہم اور عملی کردار ہے۔ صحت مند آدمی کے جسم میں اوسطاً تین سے چار گرام تک لوہا موجود ہے۔ خون کے خلیات میں لوہے کے بغیر خون کا وجود ممکن نہیں۔ لوہے کے مرکبات پر مشتمل ایک پروٹین ہیموگلوبن خون کا اہم جزو ہے جو آکسیجن دوسرے خلیات تک پہنچاتا ہے۔ اس طرح عضلات میں تنفس کا عمل جاری رہتا ہے۔

بالغ مرد اور عورت کو روزانہ 10 سے 18 ملی گرام لوہے کی ضرورت ہے۔ جسم میں لوہے کی کمی کی وجہ سے خون کی کمی (انیمیا) کے مرض کا خطرہ ہے۔ آدمی کے علاوہ چوپایوں اور دوسرے جانوروں میں لوہے کی اہمیت ناگزیر ہے۔

مقدار کے اعتبار سے لوہا زمین میں پائے جانے والے وافر عناصر میں اہم ہے۔ ارضیاتی ماہرین کے مطابق زمین کے مرکز کے بیرونی اور اندرونی حصے پرتوں پر مشتمل ہیں۔ زمین کے اوپری پرت، قشرِارض میں فراوانی کے اعتبار سے عناصر کی ترتیب پڑھیں۔

۱۔ آکسیجن (Oxygen)

۲۔ سلیکان (Silicon)

۳۔ ایلومینیم (Aluminium)

۴۔ لوہا (Iron)

۵۔ کیلشیم (Calcium)

لوہا اور سائنسی ترقی:

ایجادات اور ایجادات میں ارتقا سے معمولات میں تیزی آگئی ہے۔ ذرائع آمدورفت، مواصلات، صنعت اور تعمیرات وغیرہ کے شعبوں میں نمایاں تبدیلیاں ہوچکی ہیں۔ ترقی کے اس کھیل میں لوہے کی حیثیت مرکزی اور بنیادی ہے۔ معاشی لحاظ سے مضبوط اقوام اس لئے ترقی یافتہ ہیں کہ انہوں نے لوہے کے خواص کو جاننے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔

محترم عظیمی صاحب فرماتے ہیں،

ہمارے اسلاف قرآن سے ہی تمام ایجادات اور سائنسی فارمولے بناتے تھے۔ یہ تفکر ہی تھا جس نے ان کے ذہن کے بند دریچے اور نئے راستے کھول دیئے تھے۔ کچھ عرصہ قبل جب میں امریکا میں تھا وہاں کئی اسٹیٹس میں گیا۔ میں نے غور کیا کہ ان لوگوں کی اس مادی ترقی کا کیا راز ہے؟ میں نے دیکھا کہ وہ عنصر تھا لوہا۔ اگر وہاں 110 منزلہ عمارت کھڑی ہے تو اس کا پورا ڈھانچا (نقشہ) لوہے کا ہے۔ اگر انڈر گراؤنڈ ریلوے اسٹیشن ہیں تو سب لوہے اور کنکریٹ سے بنے ہوئے ہیں۔ پل اوپر نیچے بنے ہوئے ہیں تو وہ لوہے کی کارفرمائی ہے، جہاز اور ہر قسم کی مشینوں میں بھی بنیادی عنصر لوہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''اور ہم نے لوہا نازل کیا۔ اس میں شدید سختی اور لوگوں کے لئے فوائد ہیں۔'' (الحدید: ۲۵)

سائنسی ایجادات پر غور کریں، کسی نہ کسی درجہ میں لوہے

کا استعمال ہے اور ایجادات کا پس منظر تفکر ہے ۔ ٹیلی فون، ریڈیو، ٹیلی ویژن ایک دن میں ایجاد نہیں ہوئے، سالوں تک بے شمار لوگوں کی خیال آزمائی، تفکر اور تجربات کے بعد وجود میں آئے ہیں۔ اگر مسلمان تفکر نہیں کریں گے تو یہ جتنے محروم اب ہیں اس سے کہیں زیادہ مفلوک الحال ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ حاکم ہیں، خالق ہیں، رب ہیں۔ اگر آپ اللہ تعالیٰ کو پہچاننا چاہتے ہیں تو کائناتی نظام میں تفکر کریں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''جو لوگ میرے لئے جدوجہد کرتے ہیں میں ان کے لئے اپنی راہیں کھول دیتا ہوں۔'' (العنکبوت:۶۹)

قدیم ادوار کے بنے ہوئے لوہے کے بنیادی نوعیت کے آلات، ہتھیار اور اوزار وغیرہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ لوہے سے مختلف قسم کے فولاد بنانے کے اصولوں سے واقف تھے۔ علاوہ ازیں وہ لوہے سے متعلق ایسی ٹیکنالوجی کا علم رکھتے تھے جو حیرت انگیز ہے۔ قرآن کریم میں بادشاہ ذوالقرنین کا واقعہ بیان ہوا ہے۔

''جب دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو اسے ان کے پاس ایک قوم ملی جو مشکل سے کوئی بات سمجھتی تھی۔ ان لوگوں نے کہا، اے ذوالقرنین! یاجوج اور ماجوج اس سرزمین میں فساد پھیلاتے ہیں، تو کیا ہم تجھے کوئی ٹیکس اس کام کے لئے دیں کہ تو ہمارے اوران کے درمیان ایک بند تعمیر کردے؟ اس نے کہا، جو کچھ میرے رب نے مجھے دے رکھا ہے وہ بہت ہے۔ تم بس محنت سے میری مدد کرو۔ میں تمہارے اوران کے درمیان بند بنائے دیتا ہوں۔ مجھے لوہے کی چادریں لادو۔ آخر جب دونوں پہاڑوں کے درمیان خلا کو اس نے پاٹ دیا تو لوگوں سے کہا کہ اب آگ دہکاؤ۔ حتیٰ کہ جب چادریں آگ کی طرح سرخ ہوگئیں تو اس نے کہا، لاؤ اب میں اس پر پگھلا ہوا تانبا انڈیلوں گا۔ یاجوج ماجوج اس پر چڑھ کر نہ آسکتے تھے اور اس میں نقب لگانا ان کے لئے اور بھی مشکل تھا۔ ذوالقرنین نے کہا، یہ میرے رب کی رحمت ہے مگر جب میرے رب کے وعدہ کا وقت آئے گا تو وہ اس کو پیوند خاک کردے گا اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے۔''

(الکہف:۹۳۔۹۸)

قارئین! غور کریں کہ آیت میں لوہے اور تانبے سے متعلق دھات کاری کی سائنس، وسیع اور عظیم منصوبہ یعنی دو پہاڑوں کے درمیان پہاڑی چوٹیوں کی بلندی تک لوہے کے تختوں سے دیوار کی تعمیر، اس پر پگھلا ہوا تانبا انڈیل کر دیوار کو یک جان اور زنگ سے محفوظ کرنا، دھاتوں کی تخلیص (refining) کا عمل اور اتنی وسیع و بلند دیوار کی تعمیر میں استعمال ہونے والے آلات اور ٹیکنالوجی — یہ سب اس دور کے ترقی یافتہ ہونے کی دلیل ہیں۔

سرورق کی تشریح

(سمجھنے کے لئے سرورق سامنے رکھیں)

سرورق میں زمین پر موجود بچہ اوپر کہاں دیکھ رہا ہے ــــ؟ نظر بچہ کی نظر کے تعاقب میں جب والدین، ماحول، تاریخی حالات و واقعات، قوم اور اسلاف سے ہوتی ہوئی آدم کے شعور پر رکی تو حقیقت جاننے کے لئے بے چین دل مطمئن نہیں ہوا۔ کیا فرد کے شعور کی ابتدا زمین پر آدم کے شعور سے ہوئی ــــ؟

کائنات میں آدم کی حیثیت اس وقت ممتاز ہوئی جب اللہ تعالیٰ نے اسے امانت پیش کی۔ آدم نے امانت قبول کر لی اور اللہ نے فرمایا کہ یہ ظالم اور جاہل ہے۔ اس سے قبل جب یہ امانت زمین و آسمان میں دیگر موجودات بشمول پہاڑوں کو پیش کی گئی تو انہوں نے عاجزی کا اظہار کیا۔

''ہم نے امانت کو آسمان، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے۔ اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ بے شک وہ ظالم اور جاہل ہے۔'' (الاحزاب: ۷۲)

ایک اور مقام پر خالق کائنات فرماتے ہیں،

''اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل فرماتے تو تو دیکھتا کہ وہ اللہ کی خشیت سے جھک جاتا، ٹوٹ کر پاش پاش ہو جاتا۔ اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لئے بیان کر رہے ہیں تا کہ وہ غور و فکر کریں۔'' (الحشر: ۲۱)

زمین پر نوع آدم کی ابتدا غار سے ہوئی۔ سرورق پر غار سے پہلے سفید پہاڑ ہے۔ یہ کس طرف اشارہ ہے؟

۱۔ پہاڑ زمین پر بظاہر شعور کی سب سے بڑی علامت ہیں ــــ ان میں سفیدی خشیت کا اظہار ہے۔

۲۔ تم دیکھتے ہو پہاڑوں کو اور گمان کرتے ہو کہ یہ جمے ہوئے ہیں، یہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہیں۔

پہاڑوں کی سفیدی اور اس کے گرد لپٹے بادلوں میں یقیناً پیغام ہے۔ نظر اس منظر پر مرکوز کی تو ادراک ہوا کہ سرورق پر سب سے اوپر سفید پہاڑ دراصل آدم کے شعور کی نفی ہے ــــ وہ شعور جو زمین پر آنے کی وجہ سے فکشن پر قائم ہے۔ زمین پر درختوں اور غاروں سے شروع ہونے والا شعور فرد کے تشخص کا وہ رخ ہے جو نافرمانی کے سبب غالب ہوا۔ آدم کا اصل شعور وہ مقام ہے جہاں سے وہ زمین پر آیا ہے۔

بچہ ایک طرف اسلاف کو دیکھ رہا ہے کیوں کہ نوع کا ریکارڈ بچہ کو منتقل ہوتا ہے۔ تصویر کا پہلا رخ یہ ہے کہ بچہ دین فطرت پر پیدا ہوا ہے اس لئے اس کی نظر آسمانی دنیاؤں میں اس منظر پر بھی ہے جب اللہ تعالیٰ نے بحیثیت نوع آدم

اسے اپنی امانت پیش کی۔ سرورق میں دیگر مناظر شعور کا ارتقا ہے جو ہر دور میں وسیع ہوتا ہے، پیدا ہونے والے بچے کے ریکارڈ میں سمٹ جاتا ہے اور بچہ کی نشوونما کے ساتھ ایک بار پھر پھیلتا ہے۔ ان ادوار میں سب سے زیادہ ہجوم موجودہ دور میں ہے۔ جسے ہم مادی شعور کا ارتقا کہتے ہیں، وہ دراصل ہجوم ہے۔ بچہ کے ساتھ پودا بھی ہے۔ بچہ وہ پودا ہے جو صحیح یا غلط تربیت کے بعد درخت بن جاتا ہے۔ (نام شائع کرنے کی اجازت نہیں۔ کراچی)

روشنی مادہ میں منتقل ہوتی ہے تو ارضی بساط پر نوع آدم کا شعور ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ بچہ کورے کاغذ کی مانند ہے۔ جب وہ آہستہ آہستہ گردوپیش سے باخبر ہوتا ہے تو اندر موجود اسلاف کا ریکارڈ بیدار ہوتا جاتا ہے اور وہ شعور پیچھے رہ جاتا ہے جو بچہ کی اصل ہے۔ لاشعور میں زمانہ کی طرز غیر متواتر ہے۔ شعور میں تواتر ہے۔ تواتر کے معنی لمحوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ اسپیس کی تقسیم ہمیں اصل سے دور کردیتی ہے۔ یقین کی جگہ بے یقینی غالب ہونے سے ہم ماحول میں چیزوں کو بے یقین نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہی تفکر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زمانہ کی تقسیم مفروضہ ہے۔ اصل زمان حقیقی ہے جس میں تغیر نہیں۔ (ڈاکٹر زبیر احمد۔ کراچی)

آدم ایک کردار ہے جو اپنی نوع کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کردار میں خوبی اور خامی کے دونوں رخ ہیں۔ گویا آدم کا کردار ایک فارمولا ہے۔ جب آدم سے نافرمانی سرزد ہوئی تو اس نے معافی مانگی کہ،

"اے رب! ہم نے اپنے اوپر ستم کیا۔ اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے۔" (الاعراف:۲۳)

یہ دعا اللہ تعالیٰ کے کلام کی وہ نورانی مقداریں ہیں جس سے نافرمانی کے حواس مغلوب ہو جاتے ہیں اور خلوص و انہماک کی مناسبت سے نور علی نور غالب ہوتا ہے۔ پیدائش کے وقت بچہ کا شعور صفر یعنی مغلوب ہوتا ہے اور نظر

لاشعوری دنیا پر ہوتی ہے۔ سات ارب آدمیوں کے شعور کی چھاپ ذہن پر پڑنے سے لاشعور نظر سے اوجھل اور شعور غالب ہوجاتا ہے۔ بچہ لاشعوری دنیا عالم ارواح سے محدود دنیا میں آتا ہے۔ آدم کا اصل مقام جنت ہے۔

ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں،

''اگر خوش رہنا ہے، جنت کی زندگی میں واپس پلٹنا ہے، دنیا کی پریشانیوں سے آزاد ہونا ہے تو تم عمر میں کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوجاؤ تمہاری کیفیت اللہ کے سامنے سات آٹھ سال کے بچے سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے۔''

تغیر کی مناسبت سے رنگ پیدا ہوتے ہیں۔ اور جہاں تغیر واقع نہیں ہوتا، وہاں بے رنگی ہے۔ سرورق میں زندگی کے تغیرات دکھائے گئے ہیں جن سے بچہ کا شعور بنتا ہے۔ (پروفیسر محمد طاہر۔ چنیوٹ)

جون 2019ء کے سرورق میں بچہ کے شعور کی ایکویشن بیان ہوئی ہے۔ تصویر سے قانون سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ آدمی لوہار کے پاس بیٹھے اور کپڑے نہ بھی جلیں تو دھوئیں سے کالے ضرور ہوتے ہیں۔ عطر فروش کے پاس بیٹھنے سے عطر کپڑوں پر نہ بھی لگے — خوش بو آتی ہے۔ عظیمی صاحب فرماتے ہیں،

''اگر آپ اپنے بچوں کو اعلیٰ کردار، اچھا اور نیک دیکھنا چاہتے ہیں تو پہلے خود نیک اور اعلیٰ کردار بنیں۔''

قانون = آدم کا شعور + اسلاف کا شعور + قوم کا شعور + تاریخی حالات و واقعات کا شعور + ماحول کا شعور + والدین کا شعور = بچہ کا شعور

ادوار بظاہر گزر جاتے ہیں لیکن بچہ (فرد) کے شعور میں زندہ رہتے ہیں اور فرد انہیں ارادی و غیر ارادی طور پر اسی طرح دیکھتا ہے جیسے سرورق پر موجود ہ بچہ آسمانی دنیا کو دیکھ رہا ہے۔ (محمد عاشق۔ ایبٹ آباد)

سرورق پر مہارت اور کمال ہنر سے ادوار کی ترتیب دکھائی گئی ہے، اس پر ادارہ مبارک باد کا مستحق ہے۔ اگر ہماری قوم میں غور و فکر اور علم و تحقیق کی اہمیت ہوتی تو ''ماہنامہ قلندر شعور'' ملک کی تمام بڑی جامعات میں نصاب کا حصہ ہوتا۔ سرورق پر سارے مناظر ہر دور میں موجود رہے ہیں، شعور جب ان سے واقف ہوتا گیا تو ذہن کی اسپیس میں ہجوم بڑھا۔ اور وہی زمین جو پہلے خالی نظر آتی تھی، اس میں پنہاں رنگ ظاہر ہوگئے۔

بساط ایک ہے، اس پر جو کچھ نظر آتا ہے وہ شعور کا سفر ہے۔ (حنا شفق۔ لاہور)

حماد علی شاہ

اللہ جمیل و یحب الجمال

اللہ خوب صورت ہے اور خوب صورتی پسند فرماتا ہے

گل و گلنار، غنچہ دہن لڑکی پر نظر پڑی تو لڑکا پڑھائی بھول کر عشق میں گرفتار ہو گیا۔ اب حکیم صاحب سبق پڑھاتے مگر توجہ نہ ہونے کے سبب لڑکے کو سبق یاد نہ رہتا۔ آخر حکیم صاحب سمجھ گئے۔

کائنات کا قیام افزائش پر ہے۔ افزائش کا ایک مفہوم اسپیس کا بڑھنا اور دوسرا رخ گھٹنا ہے۔ اسپیس کم ہوتی ہے تو فرد جہاں سے آیا ہے، اس مقام اور فرد کے درمیان فاصلہ کم ہو جاتا ہے۔ اور جب اسپیس بڑھتی ہے — فاصلہ بھی بڑھ جاتا ہے۔

۱۔ فاصلہ بڑھنے سے خوب صورتی کم ہوتی ہے۔

۲۔ فاصلہ کم ہونے سے حسن نمایاں ہوتا ہے۔

ہر شے کی خوب صورتی معین تناسب میں ہے جس پر اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو نرم و ملائم وجود ہر دل کو لبھاتا ہے۔ یہ کشش جسم کی نہیں، اس فطرت کی ہے جس پر بچہ قائم ہے۔ بچہ کی تربیت غیر فطری ماحول میں ہو تو وقت گزرنے کے ساتھ خوب صورتی مغلوب ہو جاتی ہے۔ تربیت فطری تقاضوں سے ہم آہنگ ماحول میں ہونے سے جوانی اور بڑھاپے میں داخل ہونے کے بعد بھی فطرت میں موجود کشش فرد کی کشش بن جاتی ہے۔

ربر بینڈ کو دونوں سروں سے کھینچیں، اسپیس بڑھتی ہے اور دونوں کنارے منسلک ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں۔ کھچاؤ ختم کرنے سے ربر بینڈ معمول کی حالت پر آجاتا ہے۔ یہ مثال اسپیس کے گھٹنے بڑھنے کو بخوبی بیان کرتی ہے۔

اسپیس بڑھنے سے ربر کی ہیئت متاثر ہوتی ہے اور وہ کم زور ہو کر کئی جگہوں سے کھلنے لگتا ہے۔ ربر کی فطری اسپیس کو قائم رکھیں تو بناوٹ میں توازن قائم رہتا ہے۔ حالاں کہ ربر میں اسپیس ابھی بھی موجود ہے لیکن — یہ وہ اسپیس ہے جو ربر بینڈ بنانے والے نے ربر کو ظاہر کرنے کے لئے خود متعین کی ہے۔ جب شے تخلیق کار کی متعین کردہ حدود میں رہتی ہے تو دراصل وہ بنانے والے کے ذہن کے مطابق ہوتی ہے اور اسی کے سبب خوب صورت لگتی ہے۔

بیان کی گئی مثال آدمی اور انسان پر صادق آتی ہے۔ آدمی جتنا اپنی مقداروں سے دور ہوتا ہے، اس کی خوب صورتی، بدصورتی بن جاتی ہے۔ قدرت کی متعین کردہ

مقداروں میں رہنے سے وہ احسن تقویم ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر تخلیق کیا، پھر اسے اسفل سافلین میں پھینک دیا'' (التین:۴۔۵)

احسن تقویم وہ ساخت ہے جس پر قائم رہ کر بندہ خلیفہ فی الارض کے منصب پر فائز ہوتا ہے اور یہی نوع آدم کی اصل خوب صورتی اور مقام ہے۔ اس کے برعکس جو کچھ آدمی کے اندر ہے، وہ فکشن ہے۔

بدصورت سے مراد اسفل سافلین یا بگڑی ہوئی شکل ہے جو مقداروں میں عدم توازن سے پیدا ہوتی ہے۔ فطرت میں توازن اور حسن ہے لہٰذا وہ عادات وخصائل جو فطرت کے خلاف ہیں، بدصورتی کا سبب ہیں۔

''یک سو ہو کر اپنا چہرہ دین حنیف کی طرف قائم کرلو، اس فطرت پر جس پر اللہ نے تخلیق کی ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جاسکتی۔ یہی قائم رہنے والا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔'' (الروم:۳۰)

جھوٹ بولنے والے کا چہرہ دیکھیں۔

لالچ اور مکاری چہرہ کا زاویہ بدل دیتی ہے۔

غرور سے نرمی کی جگہ جمود آجاتا ہے۔

نفرت آنکھوں کی چمک وحشت میں بدل دیتی ہے۔

غصہ سے معصومیت کی جگہ فرعونیت لے لیتی ہے۔

اس کے برعکس سچ بولیں اور چہرہ پر چمک دیکھیں۔

خلوص بندہ کو خالص کر دیتا ہے۔

معاف کرنے والے کا چہرہ پُرسکون ہوتا ہے۔

مسکراہٹ بند دروازے کھولتی ہے

اور محبت فاتح عالم بن جاتی ہے۔

خوب صورتی کا تعلق محبت سے ہے اور محبت ایسی خوشی ہے جو نفی سے گزر کر اثبات بنتی ہے — خالق کی رضا مخلوق کی رضا بن جاتی ہے۔ قرب سے چہرہ روشن اور آنکھوں میں چمک پیدا ہوتی ہے۔ دیکھنے والے لوگ ایسے فرد کے دل کا حال نہیں جانتے لیکن قربت کے عکس کو خوب صورتی کا نام دیتے ہیں۔

قربت یا محبت کسی بھی شے سے ہوسکتی ہے۔ موسیقی سے جنون کی حد تک محبت کرنے والا موسیقی میں جذب ہوجاتا ہے، نتیجہ میں سروں میں سحر پیدا ہوتا ہے اور دنیا اسے بہترین گلوکار یا موسیقار کہتی ہے — موسیقی اس کی خوب صورتی کا ذریعہ بن گئی۔ بظاہر وہ شخص واجبی نقش کا حامل کیوں نہ ہو لیکن دل کش آواز کے سبب دنیا کے لئے اس کا چہرہ دل آویز ہوگیا۔

اچھے عمل سے بندہ خوب صورت نظر آتا ہے۔ آپس کی چپقلش کو نظر انداز کر کے دوسرے افراد صرف یہ دیکھتے ہیں کہ اس نے مشکل وقت میں ہماری یا کسی کی مدد کی۔ چہرہ وہی ہے لیکن ہم دردی کے جذبات سے خدوخال کے زاویے اپنے مقام پر آگئے اور لوگوں نے اس فرد کو خوب صورت دیکھا۔ نقش و نگار وہی ہیں، رنگ بدل گیا۔

خوب صورتی نین نقش میں نہیں، کشش کے سبب ہے۔ گریز اور کشش فرد یا شے میں موجود متعلقہ وصف کے غالب ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔

ایک شخص پیسوں سے محبت کرتا ہے، پیسوں میں کم وبیش ہر مادی شے کو خریدنے اور فروخت کرنے کا احساس ہے۔ یہ احساس کشش بن کر فرد کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ فرد قربت محسوس کر کے رنگ رنگ نوٹوں کی خوب صورتی میں کھو جاتا ہے، رشتوں کو پیسوں میں تولتا ہے اور ہر شے کی قیمت لگاتا ہے۔ دولت مندوں سے وہ لوگ متاثر ہوتے ہیں جو پیسوں سے محبت کرتے ہیں۔ اپنے حال میں خوش رہنے والے کی خوب صورتی شکر کی عادت میں ہے۔

ہر فرد ذوق کے مطابق چیزوں کو خوب صورت اور بدصورت دیکھتا ہے۔ اس طرح خوب صورتی کا معیار تبدیل ہوتا رہتا ہے کیوں کہ لوگ مخصوص پیمانوں میں رویوں کو جانچتے ہیں۔

ایک لڑکا حکمت سیکھنے حکیم صاحب کے پاس گیا۔ محنت کی، حکیم صاحب بھی اس سے خوش تھے۔ ایک روز کسی طرح اس کا سامنا ان کی بیٹی سے ہوگیا — گل و گلنار، غنچہ دہن لڑکی پر نظر پڑی تو لڑکا پڑھائی بھول کر عشق میں گرفتار ہوگیا۔ اب حکیم صاحب سبق پڑھاتے مگر توجہ نہ ہونے کے سبب لڑکے کو سبق یاد نہ رہتا۔

آخر حکیم صاحب سمجھ گئے۔ بیٹی کو ایسی دوا کھلائی کہ اسے قے اور اسہال ہوگیا۔ دو روز میں چہرہ سے سرخی غائب اور پیلاہٹ نمایاں تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے بن گئے۔ خوب صورتی نہ جانے کہاں کھوگئی۔

حکیم صاحب نے کسی طرح دونوں کا سامنا کروایا۔ لڑکے نے لڑکی کو دیکھا — منہ پھیر لیا اور پڑھائی میں مشغول ہوگیا۔ حکیم صاحب کو غصہ آیا۔ اٹھے اور قے والی ٹوکری لڑکے کے سامنے رکھ دی اور کہا، کپڑا اہٹاؤ۔ اس نے کپڑا ہٹایا اور منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ حکیم صاحب نے لڑکے سے پوچھا — تجھے اس سے محبت تھی؟

خوب صورتی اور بدصورتی کا ہمارا معیار فکشن ہے۔ اگر معیار کسی پیمانہ پر قائم ہے تو پیمانہ محدود ہوتا ہے۔ محدود شے ایک حالت میں قائم نہیں رہتی۔

ہر قوم میں خوب صورتی کا تصور مختلف ہے۔ کوئی سرخ و سفید رنگ سے متاثر ہوتا ہے تو کسی کے لئے سانولا رنگ جاذبِ نظر ہے۔ کوئی گندمی رنگ پر فدا ہے تو کسی کے لئے حسن کا معیار سیاہ رنگ ہے۔

عشق کی لازوال داستانوں میں ایک قصہ لیلیٰ مجنوں کا ہے۔ لیلیٰ کے معنی سیاہ کے ہیں۔ کہتے ہیں کہ لیلیٰ کالی تھی اور مجنوں اس پر جان و دل سے فدا تھا۔ جذبات میں گہرائی کا یہ عالم تھا کہ ہر ذرّہ میں چمک اسے لیلیٰ محسوس ہوتی۔ مجنوں ایک روز سمندر کنارے ریت چھان رہا تھا، کسی نے پوچھا، کیا کر رہے ہو؟

جواب دیا، لیلیٰ کو دیکھ رہا ہوں۔

سوال کرنے والا ہنس دیا اور بولا، مجنوں میاں! ریت کے ذرّات میں لیلیٰ کہاں—؟

مجنوں بولا، کیا تمہیں ان ذرّات میں لیلیٰ نظر نہیں آتی؟ ذرّات میں چمک لیلیٰ کے دم سے ہی تو ہے!

خوب صورتی کے بارے میں دانش ور کہتے ہیں،

★ ہر شے میں خوب صورتی ہے مگر ہر آنکھ اس کا ادراک نہیں کرتی۔ (حکیم کنفیوشس)

★ خوب صورتی کا تعلق دل سے ہے، دل سیاہ ہو تو چمکتی آنکھیں کچھ کام نہیں دیتیں۔ (حکیم بوعلی سینا)

★ آئینہ میں ہر روز چہرہ دیکھو۔ بری صورت ہے تو برا کام نہ کرو تا کہ دو برائیاں جمع نہ ہوں۔ اچھی صورت ہے تو برا کام کر کے خراب نہ کرو۔ (افلاطون)

★ زندگی کے دو اہم انعامات خوب صورتی اور سچائی ہیں۔ خوب صورتی کو میں نے محبت کرنے والے کے دل میں پایا کہ یہ چہرہ میں نہیں، دل کی روشنی میں ہے جب کہ سچائی محنت کرنے والے کے ہاتھوں میں نظر آئی۔ (خلیل جبران)

★ بہترین اور خوب صورت اشیا دیکھی اور چھوئی نہیں جاسکتیں، محسوس کی جاتی ہیں۔ (ہیلن کیلر)

★ خوب صورتی کی تلاش میں ہم چاہے پوری دنیا کا چکر لگالیں، اگر وہ ہمارے اندر نہیں ہے تو باہر نہیں ملے گی۔ (ایمرسن)

سب تعریفیں ایک بات کہتی ہیں کہ حسن — حسنِ عمل سے ہے۔ عمل سے ہیئت بنتی ہے، ہیئت بدلنے سے مقداریں متاثر ہوتی ہیں اور جن مقداروں پر بندہ پیدا کیا گیا ہے، اس پر دوسرا پرنٹ آجاتا ہے۔ رنگ گڈمڈ ہوتے ہیں اور بندہ گڈمڈ رنگوں کی طرح کوّے کی مانند ہو جاتا ہے جو ہنس کی چال چلنے کی کوشش میں اپنی چال بھول گیا۔

اولیاء اللہ خواتین میں ایک نام بی بی ام ہارونؒ ہیں۔ بڑی تعداد میں مرد اور خواتین ان کے شاگرد تھے اور فیض حاصل کیا۔ آپ فرماتی ہیں،

''اللہ جس کو پسند کرتا ہے وہ خوب صورتی کا پیکر بن جاتا ہے۔''

''ایک سو ایک اولیاء اللہ خواتین'' میں تحریر ہے،

''بی بی ام ہارونؒ کو رات کی تاریکی میں اپنے خالق و مالک کی عبادت کرنے میں خاص لطف حاصل ہوتا تھا۔ جب سپیدۂ سحری* نمودار ہوتا تو فرماتیں:

'ہائے دوری ہوگئی'

مطلب یہ کہ رات کی تاریکی میں اپنے خالق کی عبادت کرنے میں جو لطف حاصل ہوتا ہے وہ دن کے وقت نہیں ہوتا۔ بی بی ام ہارونؒ کے بال بہت خوب صورت اور لانبے تھے۔ اس قدر چمک دار اور ملائم تھے کہ خواتین رشک کرتی تھیں۔ کسی نے پوچھا! آپ کے بالوں کے حسن میں کیا راز مخفی ہے۔ فرمایا: اللہ مجھے پسند کرتا ہے میری ہر چیز خوب صورت بن گئی ہے۔''

*سپیدۂ سحری (صبح کی سفیدی یا روشنی)

پُراسرار مقامات

آپ سوال کر سکتے ہیں کہ کراچی میں بھی گرم پانی کے کنوئیں ہیں اور امریکا کے یلو اسٹون پارک میں تو 275 ڈگری فارن ہائیٹ (135 ڈگری سینٹی گریڈ) کے گرم ترین پانی کے چشمے ہیں پھر امیزون کے دریا کی خصوصیت کیا ہے ــــ؟

پیدائش کے بعد سے خوشیاں اور غم رات اور دن کی طرح آدمی کے ساتھ رہتے ہیں۔ یا تو آدمی خوشی اور غم سے بے نیاز ہوکر رات اور دن کے فرق سے آزاد ہوجائے یا پھر دن رات کی تفریق سے نکل کر خوشی اور غم سے بے نیاز ہوجائے۔ دونوں حالت میں دن رات اور خوشی وغم ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔

نوع آدم کو خوف وغم سے آزاد کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے الہامی کتب اور ہادی بھیجے۔ آخری الہامی کتاب قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر لوگوں کو زمین پر سیر کرنے کی دعوت دی ہے کہ دیکھیں زمین پر کیا کچھ تعمیر نہیں ہوا ــــ زمین کتنے خزانوں سے مالا مال ہے۔ کیسی کیسی عظیم الشان سلطنتیں بنیں اور بکھر گئیں۔ بعض صحیح حالت میں موجود ہیں اور بیش تر اپنی نشانی کھنڈرات کی شکل میں چھوڑ گئیں۔ زمین پر سیر کی دعوت سے تغیر کا مشاہدہ ہوتا ہے اور آدمی خوف وغم کی حقیقت جان لیتا ہے۔

کائنات میں صرف زمین پر تحقیق کی جائے تو ان گنت وسائل، نعمتیں اور رموز ظاہر ہوں گے مگر وسائل کی فہرست ختم نہیں ہوگی۔ زمین پر جن مقامات کی طرف آدمی متوجہ ہوا ہے ان پر سالوں سے تحقیق ہو رہی ہے۔ مضمون میں ان مقامات میں سے چند کا ذکر ہے جہاں جانے والا ہر شخص حیرت سے دوچار ہوتا ہے۔

☼ ☼ ☼

وادی بیدا ــــ یا ــــ وادی جن:

مدینہ کے شمال مغرب میں تقریباً 30 کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک مقام ایسا ہے جہاں آپ گاڑی چھوڑ دیں تو انجن بند ہونے کے باوجود گاڑی خود بخود چلنا شروع ہوجاتی ہے۔ وادی جن میں جانے والے بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ڈھلان کی وجہ سے گاڑیاں چل رہی ہیں لیکن انہیں بتایا گیا کہ گاڑیاں ڈھلان سے نیچے نہیں اتر رہیں بلکہ اوپر چڑھتی ہیں۔ اس وادی میں گاڑیاں نہ صرف خود بخود چلتی ہیں بلکہ ان کا رخ نشیب

کے بجائے چڑھائی کی طرف ہوتا ہے۔

وادی جن حسین مقام ہے جہاں درختوں کے جھنڈ کے پیچھے ایستادہ پہاڑ سہانا منظر پیش کرتے ہیں۔ یہاں گھر، گاؤں یا شہر نہیں ہے یعنی یہ رہائشی علاقہ نہیں۔

یہاں پہنچ کر گاڑی کا انجن بند کردیں لیکن اترنے کے بجائے گاڑی میں بیٹھے رہیں کیوں کہ تھوڑی دیر بعد گاڑی کی رفتار بڑھ جائے گی۔ اگر آپ گاڑی میں نہیں ہیں تو یقیناً خوف محسوس ہوگا۔ محققین اس مقام کو گریویٹی ہل کہتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

شانے تیم پشکا — امیزون کا ابلتا ہوا دریا:

دریا کی طوالت 6.4 کلومیٹر ہے۔ اسے دنیا کا واحد ابلتا یا کھولتا ہوا دریا کہا جاتا ہے۔ امیزون کے جنگلات میں بہنے والے اس دریا کا درجۂ حرارت 45 سے 100 ڈگری سینٹی گریڈ ہے۔ یہ لاطینی امریکا کے ملک پیرو کے علاقہ ''ماین تو یاکو'' میں واقع ہے۔

اسے دریافت کرنے والے محقق کا کہنا ہے کہ دریا کے آس پاس درجۂ حرارت اتنا بلند ہے کہ ناک اور پھیپھڑے جلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ پانی میں ہاتھ ڈالیں تو تیسرے درجہ تک ہاتھ جل سکتا ہے۔ انہوں نے آس پاس کئی جانوروں کی لاشیں دیکھیں۔ دراصل دریا کی نوعیت سے ناواقف جانور پانی پینے اترتے ہیں تو ابل کر ہلاک ہوجاتے ہیں۔

اسے دریائے لابومبا بھی کہتے ہیں۔ ماہرین تحقیق کے لئے اس دریا کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔ آپ سوال کرسکتے ہیں کہ کراچی میں بھی گرم پانی کے کنوئیں ہیں اور امریکا کے یلواسٹون پارک میں تو 275 ڈگری فارن ہائیٹ (135 ڈگری سینٹی گریڈ) کے گرم ترین پانی کے چشمے ہیں جہاں پانی کئی میٹر ہوا میں اچھلتا ہے۔

ساری دنیا میں گرم پانی کے ذخائر ہیں پھر امیزون کے دریا کی خصوصیت کیا ہے — ؟

دنیا کے تقریباً ہر خطہ میں کھولتے ہوئے یا گرم پانی کے چشمے اور نہریں موجود ہیں لیکن ان میں اور امیزون کے دریا میں موجود فرق محققین کی توجہ کا باعث ہے۔

پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ گرم پانی کے چشمے یا نہریں کیوں ہوتی ہیں — ؟ دنیا میں جہاں بھی گرم پانی کے ذخائر ہیں وہ آتش فشاں کے قریب ہیں۔ آس پاس علاقوں کی ہر چیز کو کھولتا ہوا لاوا گرم رکھتا ہے اس وجہ سے قریب موجود پانی کا ذخیرہ گرم ہوجاتا ہے۔

شانے تیم پشکا کے معنی سورج کی حرارت سے ابلنے والی شے ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ دریا میں پانی کے درجۂ حرارت کی وجہ سورج کی حرارت نہیں بلکہ اس مقام پر زمین کی اندرونی حدت ہوسکتی ہے — لیکن زمینی حقائق نے محققین کو شش و پنج میں ڈال دیا ہے۔

دریائے شانے تیم پشکا کی خاصیت پڑھئے۔

امیزون کے ابلتے ہوئے اس دریا کے سب سے قریب جو آتش فشاں ہے وہ چار سو (400) میل دور

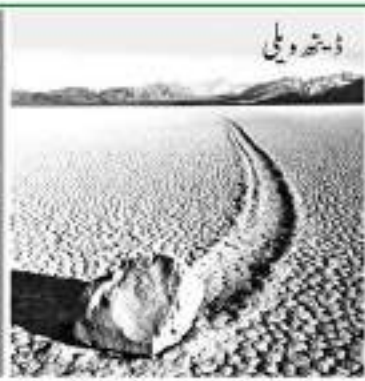

ہے۔ دو رویہ سڑک کے برابر چوڑائی والے 6.4 کلو میٹر طویل دریا کے پانی کو گرم رکھنے کے لئے اتنا دور موجود آتش فشاں کوئی کردار ادا نہیں کر سکتا۔ پھر دریا کا پانی گرم ہونے کی وجہ کیا ہے؟

ایمزون کے لوگوں میں اس حوالے سے دل چسپ کہانیاں مشہور ہیں لیکن سائنسی طور پر گرمی کی حقیقت سے فی الحال واقفیت نہیں۔ یقیناً قدرت کے ایسے راز وہاں موجود ہیں جن پر سے پردہ اٹھنا باقی ہے۔

○ ○ ○

نازکا لائنز — جنوبی پیرو:

کیا آپ نے ان مصوروں کی ڈرائنگ دیکھی ہے جو قلم روکے بغیر تصاویر بناتے ہیں یعنی ایک دفعہ قلم کاغذ پر رکھتے ہیں اور تصویر مکمل ہونے پر قلم یا برش اٹھاتے ہیں — ؟ یقیناً دیکھی ہوں گی اور ہو سکتا ہے بچپن میں ایسی تصویر بنانے کی کوشش بھی کی ہو۔ کیا آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ قلم یا برش اٹھائے بغیر کتنی بڑی تصویر بنائی جا سکتی ہے؟ چھ انچ، ایک فٹ یا دس فٹ؟

تصور کریں اس مصور کا جس نے ہاتھ روکے بغیر بندر کی تصویر بنائی جس کا قد 190 فٹ اور لمبائی 330 فٹ ہے اور بندر ہی نہیں — 216 اور 320 فٹ قد کے حامل پرندے اور 150 فٹ لمبی مکڑی کے ساتھ اس فہرست میں کئی تصاویر ہیں۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ تصاویر 100 قبل مسیح سے 800 ء کے درمیان یہاں موجود تہذیب نازکا کے لوگوں نے بنائی تھیں۔ اس وجہ سے اس علاقہ کو نازکا لائنز کہتے ہیں۔ یہ صحرائی علاقہ ہے اور آج جنوبی پیرو میں واقع ہے۔ زمین کے فرش پر بنی اتنی بڑی تصاویر کو زمین پر کھڑے ہو کر دیکھنا مشکل ہے۔ موجودہ دور ان کا جہات سے 1920ء میں آگاہ ہوا۔

زمین کے فرش پر اس قدر بڑی اور طویل تصاویر بنانے کا مقصد کیا ہے — ؟ محقق تحقیق و تلاش میں مصروف ہیں۔ معلوم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ان تصاویر کو بنا کر کیا نتائج حاصل کئے جاتے تھے۔ ابھی تک محققین یہی بتا سکے ہیں کہ یہ لائنیں دو ہزار

سال پہلے بنائی گئی تھیں۔

حیرت ہے کہ بنانے والوں نے کیسے معلوم کیا کہ جو تصویر بنی اس کی پیمائش درست ہے؟200 فٹ لمبی تصاویر کو زمین پر کھڑے ہوکر دیکھ نہیں سکتے، پھر وہ لوگ کہاں کھڑے ہوکر تصاویر بناتے تھے؟ ماہرین اس بارے میں سوچ رہے ہیں، قارئین آپ بھی سوچئے۔ کوئی بات ذہن میں آئے تو لکھ کر بھیج دیجئے۔

☼ ☼ ☼

خود بخو چلنے والے پتھر ــــ ڈیتھ ویلی:

ڈیتھ ویلی یا موت کی وادی مشرقی کیلیفورنیا میں صحرا ہے جہاں پانی کا نام ونشان نہیں اور زمین سخت ہے۔ خشکی و گرمی کی وجہ سے اس جگہ کا نام موت کی وادی رکھا گیا۔ جگہ کتنی پُرخطر ہو، تحقیق کا جنون رکھنے والے پہنچ جاتے ہیں۔ اور یہی موت کی وادی میں ہوا۔ وہاں جانے والوں کو صحرا کی سخت زمین پر کچھ پتھر نظر آئے۔ لوگوں کو ان پتھروں کے پیچھے نشانات نے متوجہ کیا۔ جیسے کسی نے پتھروں کو دور سے پھینکا ہو اور وہ زمین سے رگڑ کھاتے ہوئے کافی فاصلہ طے کرکے رک گئے ہوں۔ بات مشہور ہوئی تو کئی لوگ یہاں آئے اور حیران ہوئے کہ بھاری بھاری پتھر جن میں بعض کا وزن 200 پونڈ کے قریب تھا، انہیں کون پھینکتا ہے اور وہ کس طرح رگڑ کھاتے ہیں۔ تحقیق کے بعد اندازہ ہوا کہ پتھروں کی حرکت فوری نہیں ہوتی بلکہ بعض دفعہ کئی سال بعد کسی ایک پتھر کی حرکت کا ثبوت ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نظام میں لوگوں کو ہدایت کے ساتھ درپیش مشکلات کا حل موجود ہے۔ اسی نظام کے تحت خواب میں عظیم نظمیں لکھی گئیں اور محققین کو ایجادات کا سراغ بھی خواب میں ملا۔ ایک مثال بینزین ہے۔

معروف ادارہ ''نیشنل جیوگرافک'' کے محققین نے ڈیتھ ویلی کے سفر کا ارادہ کیا۔ یہ لوگ وہاں جا کر بیٹھے۔ ایک پتھر کو چلتے ہوئے دیکھا جو صحرا کی پتھریلی زمین پر نشان بناتا ہوا دور تک گیا۔ محققین کے سامنے جو حقیقت آئی وہ ایسی ہے کہ سنتے ہی لوگ گومگو کی کیفیت میں آجاتے ہیں۔ آپ بھی پڑھئے۔

ان کا کہنا ہے کہ خوفناک صحرا کی پتھریلی زمین پر ہوا اور برف کی وجہ سے پتھر حرکت کرتے ہیں۔ جی ہاں! برف۔ اس وقت موت کی وادی میں موسم سہانا تھا، بہت ہلکی بارش ہوئی۔ موسم نے بارش کے پانی کو اتنا جما دیا کہ برف کی پتلی تہ بن گئی جس پر پھسلن ہوتی ہے۔ تیز ہواؤں نے ایک پتھر کو اس پھسلن پر دور تک دھکا دیا جس کا نشان پتھر کی رگڑ کی شکل میں رہ گیا۔ ڈیتھ ویلی گرم مقام ہے۔ حیرت انگیز دریافت پر محققین انگشت بدنداں ہیں کیوں کہ وادی میں موجود ایسے پتھر ماضی میں حرکت کرچکے ہیں جن کا وزن 200 پونڈ تھا۔

☼ ☼ ☼

خون کا آبشار ــــ انٹارکٹیکا:

1911ء میں انٹارکٹیکا میں تحقیق وتلاش میں مشغول چند محققین نے برف کی سفید چادر پر لال رنگ کی آبشار

دیکھی۔ وہاں آبادی نہیں ہے اس وجہ سے کسی قسم کی ماورائی باتیں اس آبشار سے منسلک نہیں۔ تحقیق کے بعد نظریہ پیش کیا گیا کہ یہاں ایک قسم کی الجائی ہے جو پانی کو سرخ کر کے بہا رہی ہے۔ نظریہ ثابت نہ ہو سکا۔

سوال یہ تھا کہ گلیشیئر کے بیچ میں آبشار کیسے بہہ رہی ہے کیوں کہ دائیں بائیں جمی ہوئی سخت برف ہے۔ سال 2016ء اور 2017ء میں ریڈیو ایکو ساؤنڈنگ (تیکنیک جس میں ریڈیو فریکوئنسی کی لہروں کے ذریعے گلیشیئر کی تفصیلات معلوم کی جاتی ہیں) کے تحت معلوم کیا گیا کہ سرخ پانی دراصل گلیشیئر کی گہرائی میں ایسی نہر ہے جس میں بڑی مقدار میں نمک ہے۔ نہر جب زمین پر موجود لوہے کے ذخائر سے گزرتی ہے تو لوہا اس میں حل ہو جاتا ہے۔ لوہے کے محلول پر مبنی یہ پانی زیر زمین حرکت کی وجہ سے اتنا گرم ہوتا ہے کہ جمتا نہیں اور جب گلیشیئر سے باہر آتا ہے تو لوہے کی مقداروں کا آکسیجن سے کیمیائی عمل ہوتا ہے جس کی وجہ سے پانی زنگ شدہ لوہے جیسا سرخ نظر آتا ہے۔

☼ ☼ ☼

پریوں کے دائرے — نیمیبیا:

صحرائے نیمب میں لاکھوں کی تعداد میں عجیب و غریب دائرے نظر آتے ہیں۔ دو میٹر سے لے کر 12 میٹر یعنی سات سے 39 فٹ قطر کے یہ دائرے دیکھ کر لگتا ہے شہد کی مکھیوں کا میلوں میل لمبا چھتا ہے۔ ابھی تک راز ہے کہ صحرا میں ایسے دائرے کیوں بنتے ہیں۔

چھپا ہوا ساحل — میکسیکو:

میکسیکو کے قریب ایک جزیرہ پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو دور تک ہریالی نظر آتی ہے۔ گھاس پھونس، درخت، مختلف اقسام کے پودے۔ سمندر سے دیکھا جائے تو چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں نظر آتی ہیں مگر جب کشتی کے ذریعے پہاڑیوں کے درمیان میں بنی دراڑوں سے گزریں تو یہاں دنیا ہی الگ ہے۔ یہ بہت بڑا گڑھا ہے جس کے آدھے حصہ تک سمندر کا پانی آتا ہے اور بقیہ آدھے حصہ میں خشکی ہے اور اس ساخت نے یہاں ساحل کا ماحول بنا دیا ہے۔ چھپے ہوئے ساحل تک پہنچنے کا واحد راستہ سمندر سے ہے کیوں کہ گڑھے کی اونچائی اتنی ہے کہ اترنا ممکن نہیں۔

سوال ہے کہ جزیرہ میں ساحل کے قریب اتنا بڑا گڑھا کیسے بن گیا؟ جواب ہنوز حل طلب ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ گڑھا آتش فشاں کی وجہ سے بنا لیکن بات یقینی نہیں۔

☼ ☼ ☼

ڈیولس غار — یونان:

یونان کے شہر ایتھنز کا زمین دوز ڈیولس غار ایسا مقام ہے جہاں برقی آلات جواب دے جاتے ہیں۔ قطب نما گول گول گھومنا شروع کر دیتا ہے اور اگر آپ وہمی ہیں تو پانی کے قطرے اوپر کی طرف جاتے ہوئے نظر آسکتے ہیں۔ ایتھنز کے پینٹالی نامی پہاڑ کے قریب ڈیولس غار میں جتنے لوگ گئے ہیں، ان کے مطابق اس

جگہ برقی آلات اور قطب نما راہ نمائی سے انکار کر دیتے ہیں۔ لوگوں نے یہاں روشنی کے گولے دیکھنے اور عجیب وغریب آوازیں سننے کا دعویٰ کیا ہے۔

غار کے اندر جانے والے بعض افراد تھوڑی دیر کے لئے یادداشت سے بیگانہ ہوئے۔ اس وقت ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں اور کیوں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ غار میں پانی مخالف سمت میں بہتا ہے۔ یہاں جانے والے بعض سراغ رساں واپس نہ آسکے۔ غار کے باہر چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کے نشانات ہیں جس نے اسے پُراسرار بنادیا ہے۔

جس طرح دیگر مقامات کے بارے میں عجیب و غریب باتیں مشہور ہوئیں، ڈیولس غار کی حقیقت بھی فرضی پرتوں میں لپٹی ہوئی ہے۔

یہ سارے مقامات ہمارے لئے معمہ ہیں۔ ان کی ساخت اور یہاں موجود حرکات کا تعلق تخلیقی فارمولوں سے ہے۔ وادی جن میں کشش کا عمل ہو یا موت کی وادی میں برف کی تہ کا بننا — سب تخلیقی فارمولوں سے مزین ہے جس کا وقوف غیر جانب داری سے غور کرنے والے کے لئے ممکن ہے۔ علم الابدان (اناٹومی) سے لے کر ستاروں اور سیاروں کی حرکات کے بارے میں اسلاف کی لکھی ہوئی کتابوں نے موجودہ سائنس کو بنیاد فراہم کی۔ ہمیں بھی اطراف میں غور کر کے قدرت کی کارسازی کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

☼ ☼ ☼

برطانیہ میں موجود اسٹون ہینج 1660ء سے محققین کی توجہ کا مرکز ہیں۔ بظاہر دائرہ میں کئی پتھر عمودی حالت میں ہیں، جن کے اوپر افقی حالت میں پتھر رکھے ہیں۔ اوپر کے پتھر نیچے کے پتھر سے بڑے ہیں۔ لمبائی 30 فٹ اور وزن تقریباً 25 ٹن ہے۔ محققین کہتے ہیں کہ پتھر 20 میل دور سے یہاں لائے گئے۔ اب تک معلوم نہیں ہوسکا کہ اسٹون ہینج کیسے بنے، کہاں سے آئے، ان کا مقصد کیا تھا۔ کیا ان کی ترتیب میں کوئی خاص بات ہے؟ جدید آلات نشان دہی کرتے ہیں کہ ان پتھروں کو رکھنے کا سلسلہ تقریباً ساڑھے پانچ ہزار سال پہلے شروع ہوا اور یہ ایک وقت کے بجائے مختلف ادوار میں رکھے گئے۔ 1901ء میں ان میں سے کئی پتھروں کو جوڑے تھے یا گر گئے تھے، سیدھا کیا گیا اور کچھ پتھروں کی جگہ تبدیل کی گئی۔ بڑی بڑی کرینیں استعمال ہوئیں۔

اسٹون ہینج سے منسلک کئی داستانیں ہیں جو کبھی الف لیلیٰ اور کبھی داستان ہوش ربا کا منظر پیش کرتی ہیں۔ لیکن یہ بات ظاہر ہے، ماضی میں ایسے ادوار گزر چکے ہیں جن کے پاس موجود ٹیکنالوجی آج کے دور میں موجود نہیں۔ آدمی سوچتا ہے کہ اس دور میں لوگوں کو ایسا کیا کام پڑ گیا کہ ٹنوں وزنی پتھر اٹھا کر ایک دائرہ میں رکھ دیئے —؟

ملک محمد ناصر

سفر جاری ہے

ہزاروں تصویریں بنا کر بھی مصور کی روح بے چین ہے۔ وہ تصویر کہاں ہے جو اس کی چوکھٹ پر سجی ہے لیکن باہر نہیں آتی — ؟

نماز جنازہ ادا کی جا چکی تھی، اجتماعی دعا کے بعد لوگ ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہوئے رخصت ہو رہے تھے۔ مرنے والے کا آخری دیدار کرنے کے بعد رشتہ داروں نے میت کو کندھوں پر اٹھایا اور قبروں کے درمیان بنے ہوئے راستہ سے گزر کر آخری آرام گاہ کی طرف لے گئے۔

وہ بے ثبات دنیا اور لوگوں کے رویوں کے بارے میں سوچتا ہوا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ان کے پیچھے چلنے لگا۔ چاروں طرف قبروں کو دیکھ کر کچھ دیر کے لئے ذہن ان قبروں میں کھو گیا۔ دھوپ کی تپش سے پسینہ میں شرابور تھا۔ سانس پھول گیا تھا۔ کندھے پر رکھے سفید رومال نما کپڑے سے سر اور چہرہ صاف کیا اور ایک پختہ قبر کی سلیب پر بیٹھ گیا۔

میت کو قبر میں اتارنے کی تیاری ہو رہی تھی۔ لوگ قبر کے چاروں طرف دائرہ میں کھڑے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لئے مشورے دے رہے تھے۔

اس نے گہرا سانس لیا۔ چاروں طرف دور تک چھوٹی بڑی، اونچی نیچی کچی پکی قبریں — دائیں طرف والی قبر حالیہ بارشوں کی وجہ سے بیٹھ گئی تھی۔ گہرا گڑھا بن گیا تھا۔ جھانک کر گڑھے کے اندر دیکھا۔ کچھ نہیں تھا!

''وہ کہاں گیا — ؟''

''کون — ؟''

''جس کو اس قبر میں اتارا گیا تھا۔''

''خاکی لباس تھا جو خاک میں خاک ہو گیا اور اندر وجود اصل کی طرف لوٹ گیا۔''

''موت کیا ہے — ؟'' سوال اس کے سامنے تھا۔

''کیا اجزا کا بکھرنا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا موت ہے اور یہ انسان کیا ہے — ؟''

''انسان وحدت میں علم ہے، سوچ اور کثرت میں نگاہ ہے۔ علم کو فنا نہیں۔ کثرت رنگ بدلتی ہے اور بدلتے ہوئے رنگوں کے ساتھ سفر جاری رہتا ہے۔''

اتنے میں کلمۂ شہادت کی آواز آئی۔ میت کو لحد میں اتارا جا رہا تھا۔ ''قبر کیا ہے — ؟''

''قبر گڑھا ہے جہاں مٹی کو مٹی کے سپرد کیا جاتا ہے۔''

''اور جس کو قبر نصیب نہ ہو؟''

دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

برگد کے سائے میں بیٹھ کر سوچا کہ بیج بھی قبر ہے جہاں سے نئی زندگی کی راہیں کھلتی ہیں۔ بیج میں تناور درخت پہلے سے موجود ہے۔ بیج کو زمین کی کوکھ میں دبایا جاتا ہے تو اندر میں سے زندگی ظاہر ہوتی ہے۔ بیج فنا ہوتا ہے اور فنائیت بقا ہے۔

ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں کہ

''تغیر حرکت کا دوسرا نام ہے۔ کسی شے میں جب تک حدود کا تعین نہ ہو حرکت واقع نہیں ہوتی۔''

اسپیس یا حد بندی میں واقع ہر شے میں تغیر ہے اور تغیر محدودیت کا دوسرا نام ہے۔ آدمی لباس کے خول میں بند زندگی گزار رہا ہے۔ اس کا وجود بھی ایک قبر ہے جس میں وہ عالم ناسوت کے مناظر دیکھ رہا ہے۔ اس قبر نے ہر شے کو جکڑ بندیوں میں رکھا ہے۔ میر تقی میرؔ نے سورج کے طلوع و غروب کا منظر دیکھ کر خوب کہا ہے،

گور کس دل جلے کی ہے یہ فلک
شعلہ اک صبح یاں سے اٹھتا ہے

قرآن کریم میں ارشاد ہے،

''اے گروہ جن وانس! اگر تم زمین اور آسمانوں کے کناروں سے نکل سکتے ہو تو نکل کر دکھاؤ، تم نہیں نکل سکتے مگر سلطان سے۔'' (الرحمٰن: ۳۳)

اسپیس ہر لمحہ تغیر ہے۔ حضرت آدمی نے محدودیت کو اس حد تک اپنا لیا ہے کہ اب وہ اس کو ملکیت اور گھر سمجھتا ہے۔ شاید معلوم نہیں کہ اس کو ابھی طویل سفر طے کرنا ہے — جاننے کے لئے کہ دیوار کے اس پار کیا ہے اور کون کون سی دنیائیں آباد ہیں۔ یقیناً انسان خسارہ میں ہے جس نے عجلت میں صبر نہ کیا اور نقصان اٹھایا۔

محترم عظیمی صاحب فرماتے ہیں کہ

''تالاب میں فوارہ ہے۔ فوارہ ابلتا ہے تو پانی تالاب میں گرتا ہے۔ پانی گرنے سے تالاب میں بے شمار دائرے بنتے ہیں، یہ بے شمار دائرے تارے ستارے اور کہکشانی نظام ہیں جو ہر آن حاضر غیب کا نظارہ ہیں۔ دائرے اپنی بساط میں رہتے ہوئے سفر کرنے کے بعد فنا ہو جاتے ہیں۔ دائروں کا فنا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ دائرے اور بنیں گے۔ کہیں دائرہ چھوٹا اور کہیں بڑا۔ اس حساب سے ہر دائرہ کائنات کا نظام ہے۔ اس قانون کا منشا یہ ہے کہ کائنات فنا ہو رہی ہے اور تعمیر ہو رہی ہے۔ جیسے جیسے دائرے فنا ہوتے ہیں اس طرح دائرے بنتے ہیں۔ دائروں کا بننا اور غائب ہونا اس پانی کی وجہ سے ہے جو پانی فوارہ سے ابل رہا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہر شے اپنی اصل کی طرف محو سفر ہے۔''

بیج (غیب) سے نکلنے والا تناور درخت محدود مدت کے لئے یہاں پڑاؤ کرتا یا ظاہر ہوتا ہے، پھل پھول دیتا ہے، بہاریں دکھاتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے۔ یہ سفر مسلسل جاری ہے۔

ماسٹر عبدالحئی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے قبرستان سے باہر کی طرف بڑھنے لگے۔ وقت جیسے رک گیا تھا۔ صرف ٹک ٹک کی تکرار تھی۔

قبر ـــ گور اور مکان

غیب ـــ ظاہر اور غیب

آنا ـــ پڑاؤ اور جانا

یہ کیسا سفر ہے جو مکمل نہیں ہوتا۔ منزل پر پہنچنے کی لگن ہے مگر منزل کہاں ہے۔ گائیک تمام عمر اس نغمہ کی تلاش میں گاتا پھرتا ہے جس کو زوال نہیں مگر وہ نغمہ کہاں ہے؟ ہزاروں تصویریں بنا کر بھی مصور کی روح بے چین ہے۔ وہ تصویر کہاں ہے جو اس کی چوکھٹ پر سجی ہے لیکن باہر نہیں آتی۔ وہ کہانی کہاں ہے جو لکھاری کے فن کی معراج ہے۔ یہ سفر کب تک جاری رہے گا۔ کیا اس منزل کی نشان دہی ہو سکتی ہے؟

سورج ڈوب رہا تھا اور وہ قبرستان کے دروازہ سے باہر نکل رہا تھا۔ ایک آواز کانوں سے ٹکرائی جیسے کوئی اس سے مخاطب ہو،

لوئے لوئے بھر لے کڑیئے جے تدھ بھانڈا بھرنا

شام پئی بن شام محمد گھر جاندی نے ڈرنا

مفہوم: اے بندہ اگر تو چاہتا ہے کہ اپنے محبوب کو محبت کا جام پیش کرے تو پھر جلدی کر، زندگی کی ساعتیں کم رہ گئی ہیں۔ ان کو غنیمت جان۔ من کے جام کو محبوب کی محبت کی شراب سے بھر لے۔ اگر زندگی کا سورج ڈوب گیا اور موت کے اندھیرے چھا گئے پھر کچھ نہیں بچے گا۔ اور تو محبوب کے پاس خالی ہاتھ جاتے ہوئے شرمندہ ہوگا۔''

سر چکرانے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ گرتا کسی نے ہاتھ تھام لیا۔ ان کا ہمسایہ ادھر سے گزر رہا تھا۔ اس نے دیکھ لیا ورنہ وہ گر جاتے۔

ماسٹر صاحب آپ کدھر؟ ہمسایہ نے انہیں اپنی موٹر سائیکل پر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

وہ اپنے لطیف صاحب ہیں نا۔ فوت ہوگئے ہیں انہیں دفنا کر آ رہا ہوں۔ ہمسایہ بولا، اللہ تعالیٰ ان کی آنے والی منزلیں آسان کرے۔

ماسٹر عبدالحئی نے سوچا، کیا یہ منزل نہیں؟

گھر آ کر وہ بستر پر لیٹ گئے اور آنکھیں موند لیں۔ اندر گھڑی کی ٹک ٹک جاری تھی۔ اتنے میں بیٹی کمرے میں داخل ہوئی۔ بابا جان! اٹھ جائیں چائے پی لیں۔ بھائی بھی دفتر سے آ گئے ہیں۔ کھانا تیار ہے۔

میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ آپ لوگ کھا لیں۔ تھکن ہے آرام کرنا چاہتا ہوں۔

دراصل ماسٹر صاحب کے دل میں کھٹکا لگا ہوا تھا۔ آج کل گھر میں موجودہ مکان خالی کر کے دوسری کالونی میں منتقل ہونے پر بحث چل رہی تھی۔ سب گھر والے چاہتے تھے کہ موجودہ مکان کو خالی کر کے دوسری کالونی میں اچھا مکان بنایا جائے۔

مگر ماسٹر صاحب راضی نہیں تھے۔

بابا جان! دیکھیں آدمی کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ ہمیں آنے والے وقت کے بارے میں سوچنا ہے۔ یہ بجا ہے کہ اس مکان میں رہائش کی تمام ضرورتیں ہیں مگر تبدیلی وقت کی اہم ضرورت ہے۔

ماسٹر عبدالحئ کے ذہن میں بیٹی کی آواز کے معنی بدلنے لگے — اگر تغیر رک گیا تو کائنات رک جائے گی۔ کُن کی آواز پر ہر شے حرکت میں ہے۔ نئی دنیائیں تلاش کرنے کے لئے ہمیں ہجرت کرنا ہوگی۔ نئی نئی دنیاؤں کی اساس حرکت میں ہے۔

اندر کی آواز کو دباتے ہوئے بولے، میں نے اس عمارت کو اپنے خون پسینہ سے بنایا ہے۔ اس میں اینٹ لکڑی کا کام بے مثال ہے۔ یہ مکان بولتی تصویر ہے۔ اس کے ذرّہ ذرّہ میں میں آباد ہوں۔ آپ لوگ مجھے کیوں گھر بدر کرنا چاہتے ہیں۔ میرا اور اس مکان کا جنم جنم کا ساتھ ہے۔

بابا جان! آپ کو وہاں ایسا ماحول ملے گا کہ سب کچھ بھول جائیں گے۔ ہر نیا ماحول پرانے ماحول پر پردہ ڈال دیتا ہے اور آپ کیوں بھول رہے ہیں کہ جو مکان اینٹ پتھر گارے سے بنا ہے وہ طبعی عمر پوری کرنے کے بعد گر جاتا ہے۔ گھر تو لوگوں سے آباد ہوتا ہے۔ آپ اٹھیں، ہم آپ کو آپ کے خوابوں کی تعبیر دکھاتے ہیں۔ وہاں جا کر آپ یہی کہیں گے کہ یہ گھر میں نہیں چھوڑوں گا۔ اس بات پر سب ہنس دیئے۔

وہ ایک دم چلّا اٹھے۔ اس مکان کی رجسٹری میرے نام ہے۔ دیکھتا ہوں اس کو مجھ سے کون چھینتا ہے۔

دیکھیں یہ مکان آپ کا ہے اور وہ گھر بھی آپ کا ہوگا۔ بات صرف منتقلی کی ہے۔ آپ نے معمولی بات کو سوہان روح بنا لیا ہے۔ سب لوگ اٹھے اور اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

ماسٹر عبدالحئ کا تعلق تدریس سے تھا۔ آج کل ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے تھے۔ انتہائی کم گو تھے۔ بیش تر وقت مطالعہ میں گزرتا تھا۔ چوں کہ سائنس ٹیچر تھے اس لئے ہر شے عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے تھے۔ ان کی سوچ کا بہاؤ باطن سے ظاہر کی طرف ہوتا تھا جب کہ کائنات کے اسرار کو جاننے کے لئے ظاہر سے باطن کی طرف سفر کرنا ہوتا ہے۔ باطن اصل ہے جس میں تغیر نہیں۔ ظاہر تغیر پذیر اور الوژن ہے۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

اصل غیب ہے۔ ہر شے غیب سے آتی ہے۔ اس سفر میں ظاہر پڑاؤ ہے۔ پڑاؤ کے بعد بھی غیب ہے یوں تکرار جاری ہے۔ سب غیب ہے پھر ظاہر کیا ہے؟

ماسٹر عبدالحئ رات بھر دوسری کالونی میں منتقلی کے بارے میں سوچتے رہے۔ اچانک انہوں نے محسوس کیا کہ اندر کوئی بول رہا ہے۔

انشا جی اٹھو اب کوچ کرو
اس شہر میں جی کو لگانا کیا

آخر یہاں سے کوچ کیوں کیا جائے۔ سب راضی خوشی رہ رہے ہیں۔ اس کوچ میں ہجرت پنہاں ہے۔

اچانک منظر بدلا — اس کالونی کے لوگ یہاں سے کوچ کر رہے تھے۔ خوب صورت مکانوں کو کیوں خالی کیا جا رہا ہے۔ وہ یہاں دوبارہ کیوں آباد نہیں ہوتے؟

اندر میں سرگوشی ہوئی، پرندے جب ہجرت کرتے ہیں تو پرانے گھونسلے خالی کر لیتے ہیں تاکہ نئے پرندے یہاں قیام کریں۔ وہ دوبارہ ان گھونسلوں کو آباد نہیں کرتے بلکہ اپنے لئے نئی جگہ نئے گھونسلے بناتے ہیں۔

تم کون ہو — ؟ ماسٹر صاحب نے پوچھا۔

تم بھول رہے ہو کہ میں تمہارا ساتھی ہوں۔ میں نے جب تمہارا لباس پہنا یعنی اس گھر کو اپنے لئے منتخب کیا تو تمہیں گھر کی تزئین و آرائش کے لئے مقرر کیا تھا۔ اب تم کہہ رہے ہو یہ مکان میرا ہے تم اسے خالی نہیں کرنا چاہتے۔ دراصل تم محدودیت کی پیداوار ہو اور محدودیت میں رہتے ہوئے تمہیں اس مکان سے محبت ہوگئی ہے۔ میں نے تمہیں پہلے بتایا تھا اس مکان کے مالکانہ حقوق تمہارے پاس نہیں ہیں۔ اب اسے خالی کرنا ہوگا۔

لیکن میں کہاں جاؤں گا — ؟ میں نے پوچھا۔

آواز نے کہا، کیوں گھبراتے ہو، نئی کالونی میں منتقل کیا جائے گا۔

مگر میں اس کالونی کے قوانین اور طرز حیات کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ سن کر آواز نے کہا،

شب بیتی چاند بھی ڈوب چلا
زنجیر پڑی دروازے پر
کیوں دیر گئے گھر آئے ہو
بجنی سے کرو گے بہانہ کیا

تم سمجھتے ہو یہ مکان خالی کر دیا گیا تو تم گھر بدر ہو جاؤ گے۔ یہ سوچ ٹھیک نہیں ہے۔ خالق کی ذات کے سوا یہاں کسی کو دوام نہیں۔ ہم ہر لمحہ تبدیل ہو رہے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ انتقال کر رہے ہیں۔

سفر تو جاری ہے، ابھی گاڑی غیب سے ظاہر ہوگی۔ کچھ مسافر یہاں اتریں گے اگلے اسٹیشن کی سواریاں چڑھیں گی۔ اور وہ گاڑی یہاں سے غیب ہو جائے گی۔ تم اپنا سفر جاری رکھو۔ قدرت کی کائنات کا مطالعہ اور مشاہدہ کرو۔ یا بدیع العجائب بالخیر یا بدیع!

صبح ماسٹر صاحب کی بیٹی انہیں جگانے کمرے میں آئی۔ آگے بڑھ کر چھوا پھر حواس باختہ ہو کر جھنجھوڑا —

گھبرائی ہوئی آواز بلند ہوئی،

اماں! بابا جان نے اپنا مکان خالی کر دیا!

بھیا! یہ مکان خالی ہو گیا!

باہر شور بپا تھا — اور اندر گہرا سکوت تھا۔

زندگی کی گاڑی غیب سے ظاہر ہوئی تھی، کچھ دیر پڑاؤ کیا اور پھر جانے کے لئے غیب ہو گئی — اسٹیشن بدل گیا لیکن سفر جاری ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

جس کے دل میں یہ عقیدہ گھر کر جائے اس کا مطمح نظر صرف وہ مقامات اور درجات ہوتے ہیں جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کے قرب سے ہے، وہ دنیا و مافیہا کو ڈھلنے والا سایہ اور محض بے حقیقت چیز سمجھتا ہے۔

بزرگ فرماتے ہیں کہ درخت اپنی اصل کے مطابق اگتا ہے اور اناج کی خوبی تخم کی موجودگی کے سبب ہے۔ سعید ماں باپ کی اولاد سعید ہوتی ہے۔ شاہ عبدالرحیمؒ دنیائے معرفت میں بڑا نام ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ان کے بیٹے ہیں۔

کتاب ''انفاس العارفین'' میں لکھا ہے کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی پیشین گوئی کی بنا پر آپ کا نام قطب الدین رکھا گیا۔ ولیوں جیسے اخلاق و اطوار کی وجہ سے سب نے ان کو ولی اللہ کہنا شروع کیا۔ یہ نام اس قدر مقبول ہوا کہ زبان زد عام ہوگیا۔

دہلی میں پیدا ہوئے۔ علمی قابلیت کم عمری میں ہی نمایاں تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں کئی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ والد نے اسی سال شادی کرادی۔ اپنی شادی سے متعلق فرماتے ہیں،

''والد ماجد نے اس بارے میں بہت عجلت فرمائی۔ یہاں تک کہ سسرال والوں سے کار خیر کو انجام دینے کا تقاضا کیا تو ان لوگوں نے سامان شادی تیار نہ ہونے کا عذر کیا۔ والد نے اپنی بات پر قائم رہتے ہوئے لکھا کہ میرا اصرار بے وجہ نہیں لہٰذا یہ کام بلا تاخیر ہونا چاہئے۔ شادی کے چند روز بعد میری ساس کا انتقال ہوگیا۔ تھوڑے دن گزرے تھے کہ اہلیہ کے نانا وفات پا گئے۔ چند دنوں بعد میرے بزرگوار شیخ عبدالرزاق کے صاحب زادہ فخر عالم دنیا سے رخصت ہوئے۔ صدمہ تازہ تھا کہ میری سوتیلی والدہ رحلت کر گئیں۔ پھر والد صاحب کو مختلف امراض نے آگھیرا اور ان کا سایۂ عاطفت ہمارے سر پر سے اٹھ گیا۔ جہاں تک ہم سمجھ سکتے ہیں ان کے جلدی کرنے میں یہی راز تھا۔''

شاہ عبدالرحیمؒ نے انتقال سے پہلے بیٹے کو خلیفہ مقرر کرتے ہوئے فرمایا،

''میرے بعد اس کے ہاتھ کو میرا ہی ہاتھ سمجھو۔''

شاہ ولی اللہؒ نے ظاہری و باطنی علوم والد سے حاصل کئے۔ شاہ عبدالرحیمؒ نے بیٹے کو غور و فکر کے ساتھ قرآن کریم پڑھنا سکھایا۔ فرماتے ہیں،

''حق تعالیٰ کی نعمتوں میں سے بہت بڑی نعمت تھی کہ میں نے کئی بار والد صاحب سے متن قرآن پڑھا۔ یہی میرے حق میں فتح عظیم کا باعث ہوا — فہم قرآن کی راہ مجھ پر کھل گئی۔''

انہوں نے وصیت میں لوگوں کو فہم قرآن کی تلقین فرمائی۔ وصیت نامہ میں سے مختصر اقتباس پیش ہے،

''قرآن عظیم کا درس اس طریقہ پر دینا چاہئے کہ قرآن کو ترجمہ کے ساتھ پڑھیں۔ الفاظ کی معنویت میں دشواری پیش آئے تو رک کر تحقیق و تفکر کریں۔ اس سے مشکل الفاظ سے متعلق مدد مل جاتی ہے۔ قرآن کے معانی کو سمجھنے کے لئے ہمیشہ غور اور تدبر سے کام لیں اور برابر اس میں مشغول رہیں۔ اس طریقۂ درس سے بڑے بڑے فیض حاصل ہوتے ہیں۔''

شاہ ولی اللہؒ 12 سال درس و مطالعہ میں مشغول رہنے کے بعد 1143ھ میں بیت اللہ کی زیارت کے لئے روانہ ہوئے۔ حجاز مقدس میں ایک سال قیام کیا۔ زیادہ وقت مدینہ منورہ میں گزارا۔ اساتذہ کرام سے ظاہری و باطنی علوم حاصل کئے۔ ان میں نمایاں شیخ ابو طاہر مدنی ہیں جن سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔

فیوض الحرمین — شاہ ولی اللہؒ کے مشاہدات پر مشتمل ہے جو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں قیام کے دوران ہوئے۔ ''آخری مشاہدہ'' کے عنوان سے لکھتے ہیں،

''میں خانہ کعبہ میں داخل ہوا۔ میں نے اپنے باطن کی طرف توجہ کی تو مجھ پر صراط مستقیم کی حقیقت کی تجلی ہوئی۔ صراط مستقیم کی حقیقت کو ایک دفعہ رسول اللہؐ نے اس طرح بیان فرمایا۔ آپ نے ایک خط کھینچا اور پھر خط کے دونوں طرف آپ اور خط کھینچتے چلے گئے۔ اور آخر میں فرمایا، یہ بیچ کا خط صراط مستقیم ہے۔ الغرض مجھ پر کعبہ میں صراط مستقیم کی تجلی ہوئی اور میں نے دیکھا کہ نفوس انسانی کے احوال و کوائف کے بیچوں بیچ صراط مستقیم کی یہ حقیقت موجود ہے۔ صراط مستقیم عبارت ہے احکام الٰہی کی اطاعت اور فرماں برداری میں ثابت قدم رہنے سے۔''

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ جن طلبا کو علم دین کا درس دیتے تھے، انہیں پہلے قرآن کا متن پڑھاتے تھے جس سے آیات کا مفہوم ذہن نشین ہو جاتا تھا۔

شاہ ولی اللہؒ نے قرآن کریم کا فارسی ترجمہ کیا۔ ''فتح الرحمٰن'' کے نام سے برصغیر پاک و ہند میں یہ فارسی زبان میں قرآن کا پہلا ترجمہ تھا جس پر مخالفین نے شور مچا دیا اور قتل کا حکم دیا۔

قلندر بابا اولیاؒ نے شاہ ولی اللہؒ کے صاحب زادہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے متعلق ایک روحانی تمثیل میں اس واقعہ کو بیان فرمایا ہے۔ مختصر پیش ہے،

''دہلی کی مسجد فتح پوری میں عصر کی جماعت کھڑی ہو گئی تھی۔ امام نے نیت باندھی مسجد کے باہر شور بلند ہوا۔ لوگ چیخ رہے تھے، 'اس شخص کو مارو'۔

لوگوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں، کچھ کے پاس خنجر تھے اور تلواریں تھیں اور کچھ نہتے تھے۔ سب نعرے لگا

رہے تھے۔'مار دو، قتل کر دو'

ان لوگوں کا ہدف شاہ ولی اللہؒ تھے جو اطمینان سے نماز ادا کر رہے تھے۔ بلاخوف وخطر نماز پڑھنے کے بعد چاروں طرف دیکھا۔ معتقدین نے کہا،'نکل چلئے، یہ لوگ دشمن ہیں۔ خدا نہ کرے کیا کر جائیں۔ آپ چھوٹے دروازہ سے نکل جائیں'۔ فرمایا،'کیا یہ لوگ خدا کے گھر کو مقتل بنانا چاہتے ہیں۔ اگر ہمارا وقت نہیں آیا ہے تو کوئی ہمارا بال تک بیکا نہیں کر سکتا اور اگر وقت آ گیا ہے تو ہر شخص کو جانا ہے'۔ شور بلند ہوا' پکڑ لو، جانے نہ پائے، اس نے دین میں پیوندکاری کی ہے۔ اس کے ساتھی بھی سزا کے مستحق ہیں'۔

نعروں کے شور میں کچھ لوگ مسجد کے صحن میں گھس آئے۔ شاہ ولی اللہؒ نے پوچھا،'کیا تم ہمیں قتل کرنے آئے ہو؟' ایک شوریدہ سر نے کہا،'ہاں! آپ اس قابل نہیں ہیں کہ آپ کو زندہ چھوڑا جائے'۔

پوچھا،'ہمارا جرم کیا ہے؟' حقارت اور طنز سے جواب دیا'اپنا جرم معلوم نہیں؟ اب تجھے آپ کی بجائے تو سے مخاطب کروں گا، کیا تو نے کلام پاک کا فارسی میں ترجمہ نہیں کیا، کیا یہ توہین نہیں ہے؟' شاہ ولی اللہؒ کو غصہ آ گیا۔ ہاتھ میں چھڑی تھی۔ چھڑی اٹھائی اور اللہ ھو کا نعرہ بلند کیا۔ کیا اثر تھا اس نعرہ میں، شاہ صاحبؒ اور ان کے ساتھی یکے بعد دیگرے مسجد سے نکل گئے۔ مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا۔

اب شاہ صاحبؒ کھاری باؤلی تک پہنچ گئے تھے کسی نے زور سے پکارا،'یہ بہروپیا بھاگنے نہ پائے'۔ لیکن نعرہ بے اثر ثابت ہوا۔ لوگ بت بنے کھڑے تھے جیسے پتھر کے مجسمے ہوں۔ گھر پہنچے تو شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اس وقت چھوٹے تھے، والد سے لپٹ گئے اور رونے لگے۔ ہاؤ ہو کی اطلاع دلّی میں پھیل چکی تھی۔

فرمایا،'بیٹے! تجھے معلوم نہیں کہ یہ دنیا والے میرے اور تیرے نبیؐ کو کیا کیا اذیتیں دے چکے ہیں۔ آنسو پونچھ لو۔ ہم عن قریب جانے والے ہیں، ہماری میراث علم ہے، تم اسے سنبھال لو'۔ بیٹے نے گردن جھکا لی اور عرض کیا،'جو اللہ کی مشیت! اگر اللہ ہم سے یہ خدمت لینا چاہتا ہے تو ہم اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس علمی اور عملی خدمت میں خرچ کر دیں گے'۔'' (احسان وتصوف)*

والد کے نقش قدم پر چل کر دو فرزندان شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ نے قرآن کریم کا اردو ترجمہ کیا۔

شاہ ولی اللہؒ نے دس حکم رانوں کا زمانہ دیکھا۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے چار سال پہلے پیدا ہوئے اور 1176ھ میں شاہ عالم ثانی کے عہد میں سرائے فانی کو الوداع کہا۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلوں کی عظیم الشان سلطنت اخلاقی بیماریوں کے سبب محکوم ہوگئی۔ مرہٹوں نے بڑے حصہ پر قابض ہونے کے بعد دہلی کی جانب

---

* کتاب''احسان وتصوف''، بہاءالدین زکریا یونی ورسٹی کے ایم۔اے اسلامیات کے نصاب میں شامل ہے۔

پیش قدمی کی۔شاہ ولی اللہؒ نے دیکھا کہ مغلیہ خاندان کم زور ہوگیا ہے تو والیِ افغانستان احمد شاہ ابدالی کو مرہٹوں سے مقابلہ کی دعوت دی۔احمد شاہ ابدالی نے دعوت قبول کی اور مرہٹوں کو بے بس کر دیا۔

اس دور میں مسلمانوں کی سماجی واخلاقی حالت زوال پذیر تھی۔آرام طلبی، عیش وعشرت، بے ایمانی اور اس قبیل کی دوسری خرابیاں عام تھیں۔شاہ ولی اللہؒ نے تصنیف وتالیف کے ساتھ اخلاقی وسماجی اصلاح کا کام کیا۔مسلمانوں میں تفرقہ ختم کرنے کی کوشش کی اور اعتدال پر زور دیا۔کوشش تھی کہ مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہوتا کہ وہ پھر سے مضبوط سلطنت قائم کریں۔

''طاعت نفس وہوا، اس زمانہ کی ایک لاعلاج بیماری یہ ہے کہ ہر ایک اپنی رائے پر چلتا ہے اور بغیر سوچے سمجھے چلا جا رہا ہے۔احکام کے معنی اور اسرار پر ہر ایک اپنی عقل سے کام کر رہا ہے اور جو کچھ جس نے سمجھ لیا ہے اس پر دوسروں سے مناظرہ اور مباحثہ کر رہا ہے۔ ہر ایک اپنے طریقہ میں تعصب برتتا ہے اور دوسروں کے طریقہ پر اعتراض کرتا ہے۔تخریبات کی کثرت ہے اور حق اس غبار میں چھپ گیا ہے۔''

معاشرتی اثرات کی وجہ سے مسلمانوں میں بیوہ عورتوں کی شادی بری سمجھی جانے لگی، آپ نے اس رسم کی مخالفت کی اور خوشی وغم کے موقع پر لوگوں کو فضول خرچی سے بھی روکا۔

''اے اولاد آدم! تم نے اپنے اخلاق کھو دیئے۔تم پر سنگ دلی چھا گئی اور شیطان تمہارا محافظ بن گیا۔ عورت مردوں پر حاوی ہوگئی اور مردوں نے عورتوں کی تذلیل کی ہے۔حرام میں تمہیں مزہ آتا ہے۔اور حلال تمہارے لئے بدمزہ بن گیا ہے۔اے اولاد آدم! تم نے فاسد رسمیں اختیار کر لی ہیں جن سے تمہارا عقیدہ صراط مستقیم پر قائم نہیں رہا۔کوئی اپنے کاروبار میں اتنا مشغول ہوتا ہے کہ نماز کے لئے وقت نہیں ہوتا اور کوئی تفریحی خوش گپیوں میں اس قدر منہمک ہوتا ہے کہ نماز کو فراموش کر دیتا ہے۔تم زکوٰۃ سے بھی غافل ہو۔تم رمضان کے روزے بھی نہیں رکھتے اور اس کے لئے طرح طرح کے بہانے بناتے ہو۔''

شاہ ولی اللہؒ نے منتشر خیال لوگوں کو فکر ونظر کی صاف اور سیدھی شاہ راہ دکھائی۔وہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے ہر ایک کو روشن ضمیری عطا کی ہے اور اس فطرت پر تخلیق کیا ہے کہ جس میں فرماں برداری ہے۔البتہ لوگ شک میں مبتلا ہو کر اپنا راستہ کھوٹا کر دیتے ہیں۔

''ہر طرح کی تعریف اس خدائے پاک کے لئے ہے جس نے سب لوگوں کو ایک ایسی فطرت عطا کی ہے جس میں اسلام اور ہدایت کو قبول کرنے کی استعداد ہے۔اور ان کی جبلت کو اس طرح بنایا کہ وہ دینِ حنیف کو بآسانی اختیار کر سکیں جس کی بنیاد آسانی اور سہولت پر ہے اور وہ ایک روشن اور واضح راستہ ہے۔ بایں ہمہ لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے گم راہی کے عمیق گڑھے میں گر کر مبتلائے شقاوت ہوئے۔''

شاہ ولی اللہؒ نے تصوف کی تعریف ان الفاظ میں کی،

''تصوف قرب الٰہی کا وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ کوشش کی جاتی ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ اور اپنے تعلق سے واقف ہو اور معرفت حاصل کرے۔ اس طرح کے ذکر و اشغال سے انسان کے اندر 'انا' کی حقیقت بیدار ہوتی ہے۔ اور انا کی حقیقت کی بیداری سے حق کا شعور حاصل ہوتا ہے۔''

اولیاء اللہ — انبیائے کرام کے روحانی علوم کے امین ہیں۔ نظام کائنات میں اولیاء اللہ کی اہمیت کے بارے میں شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں،

''اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کے پیروکاروں میں ایسے اشخاص پیدا کئے ہیں جو ان کے علم کے حامل ہوں اور ان کی لائی ہوئی شریعت کے اسرار کو سمجھ سکیں۔ ان کو انبیائے کرام کے نائب ہونے کا فخر حاصل ہے اور یہ وہ جماعت ہے جس کے ایک فرد واحد کو پورے ایک ہزار بے علم عبادت کرنے والوں پر فضیلت بخشی گئی ہے۔ ان کو آسمان کی بادشاہت میں عظیم کہا جاتا ہے اور کائنات ان کو دعائیں دیتی ہے۔ یہاں تک کہ سمندر کے اندر جو مچھلیاں رہتی ہیں وہ بھی ان کے لیے جناب اقدس سے دعا کرنے میں مشغول رہتی ہیں۔''

اس دنیا سے پہلے اور بعد میں بھی عالمین ہیں۔ یہاں آنے والے ہر فرد کا نقش پہلے کے عالمین میں موجود ہے۔ اہل بصیرت اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس کو فرد کا ریکارڈ سے منسلک ہونا یا ماضی سے رشتہ قائم رہنا کہتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں،

''عالم مثال (برزخ) کی خاصیت یہ ہے کہ بہت سی اشیا جن کو عوام غیر مادی سمجھتے ہیں اور اس کو جسم اور شکل وصورت سے منزہ سمجھتے ہیں، عالم مثال میں چلتی پھرتی اور ایک جگہ سے دوسری جگہ انتقال کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ سب لوگ ان کو ''چشمِ سر'' سے نہیں دیکھ سکتے۔''

کائنات میں ہر شے کی مقداریں معین ہیں۔ شے کا معین ہونا تقدیر ہے۔ قدریں جب متعین ہو جاتی ہیں تو فرد ان قدروں میں زندگی گزارنے کا پابند یعنی اپنی حدود میں رہنے اور وسائل کا محتاج ہے۔ آدمی حالات و واقعات، ان کے وقوع پذیر ہونے، وقوع پذیری میں اپنے اختیار اور بے اختیاری پر غور کرے تو کائنات میں قادر و قدیر ہستی اللہ کے حکم کے جاری و ساری رہنے کا علم حاصل ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ تقدیر کے بارے میں فرماتے ہیں،

''یاد رکھو! نیکی کی اقسام میں سے عظیم ترین نیکی یہ ہے کہ آدمی تقدیر پر ایمان رکھتا ہو۔ اس عقیدہ کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کو تمام کائنات عالم میں ایک ہی مدبر حکیم اللہ تعالیٰ کا تصرف نظر آئے۔ جس کے دل میں یہ عقیدہ گھر کر جائے اس کا مطمح نظر صرف وہ مقامات اور درجات ہوتے ہیں جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کے قرب سے ہے، وہ دنیا و مافیہا کو ڈھلنے والا سایہ اور محض بے حقیقت چیز سمجھتا ہے۔ اس کے دل میں یقین بیٹھ جاتا ہے کہ لوگ بظاہر جو کچھ اپنے اختیار اور

ارادہ سے کرتے ہیں، دراصل یہ ان کا اختیار نہیں۔
اس کی مثال وہ صورت ہے جو آئینہ میں نظر آتی ہے۔
ممکن ہے ظاہر بین اس کو مستقل ہستی خیال کرے
لیکن تم جانتے ہو کہ وہ کسی موجود کا عکس ہوتا ہے۔''

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے متعدد کتب تصنیف کیں۔ان میں ''حجۃ اللہ البالغۃ'' اور ''فیوض الحرمین'' شامل ہیں۔

اولیاء اللہ کا خاصہ توکل ہے — اللہ کو دروبست خالق و مالک تسلیم کرنا اور اسی سے رجوع کرنا۔

کتاب ''فیوض الحرمین'' میں لکھتے ہیں،

''میں نے رسول اللہؐ سے ایک روحانی سوال پوچھا، دنیا کے معاملات میں اسباب کو وسیلہ بنانے یا اسباب کو سرے سے ترک کر دینے میں کون سی چیز میرے لئے بہتر ہے۔سوال کر چکا تو میری طرف خوش بو کی ایک لپٹ آئی جس کی وجہ سے میرا دل اسباب، اولاد اور گھر وغیرہ سے بالکل سرد ہو گیا۔لیکن اس کے بعد مجھے کشف ہوا تو میں نے طبیعت کو اسباب کی طرف مائل پایا اور محسوس کیا کہ میری طبیعت کو اسباب سے لذت ملتی ہے اور وہ اسباب کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے۔لیکن میری طبیعت کے خلاف میری روح کا رجحان توکل کی طرف ہے اور میری روح اسباب کے بجائے توکل سے لذت حاصل کرتی ہے اور اسی کی طالب ہے۔نیز میں نے معلوم کر لیا کہ میری طبیعت اور روح میں باہم کشمکش ہے۔میرے لئے پسندیدہ روش یہ ہے کہ میں اپنی روح کے کہنے پر چلوں۔''

شاہ ولی اللہؒ کے اقوال زریں

★ تمہارا ذہن فانی چیزوں میں مستغرق ہے، اللہ کی طرف متوجہ کیوں نہیں ہوتا — ؟

★ بصیرت کے بغیر عمل کا انجام ندامت ہے۔

★ جس اعتقاد اور یقین کی بنیاد بصارت پر ہو، وہ مضبوط چٹان کی طرح اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔

★ ظاہری صورت اور اعمال نہیں، نیت اہم ہے۔

★ اسباب وسکت راستہ کی مناسبت سے مہیا ہوتے ہیں اس لئے وہ راستہ اختیار کرو جو اللہ کو پسند ہے۔

★ نوع آدم پر لازم ہے کہ وہ حیوانات سے ممتاز زندگی بسر کرے۔

★ دانائی کا تقاضا ہے کہ مخاطب کی ذہنی استعداد کے مطابق بات کرو۔

★ اگر چوپائے گھاس چریں اور درندے گوشت سے غذا حاصل کریں تو ان کے جسم کی پرورش اور نشوونما ٹھیک طور پر ہوتی ہے۔اگر چوپائے گھاس کے بغیر گوشت کھانا شروع کر دیں اور درندے گھاس کو غذا بنالیں تو ان کا مزاج بگڑ جائے گا اور یہ ان کی ہلاکت کا موجب ہوگا۔

★ اللہ جن لوگوں کو لطف وکرم سے نوازنا چاہتا ہے انہیں اپنے دوستوں کا قرب عطا کرتا ہے۔

★ ہر ایک اپنی فطرت کے مطابق عمل کرتا ہے۔ آدمی، آدمی کی جبلت پر چلتا ہے اور انسان — احسن تقویم ہے۔

دنیا کھیتی ہے

سطحی ذہن عزت کو دولت سے وابستہ کرتا ہے کہ دولت ہونے سے عزت ملتی ہے۔ آدمی مالی لحاظ سے کم زور ہو یا طاقت ور، رشتے دولت کے ترازو پر تولتا ہے۔

عزت کیا ہے—؟

کیا عزت کا تعلق دولت سے ہے—؟

خود ساختہ معیار پر رتبہ کا تعین پست ذہنی ہے!

عزت وجاہ کا خوش نما لباس زیب تن کرنے کے لئے ہم دولت جمع کرتے ہیں۔ دولت کی تشہیر کے لئے عالی شان محلات کھڑے کرتے ہیں۔ گھروں کو اس طرح سجاتے ہیں کہ ہم انہیں دیکھ کر احساس برتری اور لوگ انہیں دیکھ کر احساس کم تری میں مبتلا ہو جائیں۔ قرض لے کر بڑی بڑی گاڑیاں خریدتے ہیں۔ کیا دولت سے عزت وتوقیر کا حصول خود فریبی نہیں؟

فراعین مصر کے مقبرے، شداد و نمرود کے محلات اور قارون کے مدفون خزانے بتا رہے ہیں کہ دولت نے کسی کے ساتھ وفا نہیں کی۔ دولت صرف ان سے وفا کرتی ہے جو اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

تاریخ خود کو دہراتی ہے اور ہر زمانہ میں دولت کے غلط استعمال کو ہمارے اوپر آشکار کرتی ہے۔ بڑے بڑے شہنشاہوں کا ماضی ہر دور میں اقوام کے لئے آئینہ ہے۔ شان و شوکت اور شاہی دبدبہ کے حامل بادشاہوں کو مادر وطن میں قبر نصیب نہیں ہوئی۔ سونے چاندی کے ذخیروں اور جواہرات نے امیروں کے ساتھ وفا نہیں کی۔ مٹی نے انہیں مٹی بنا دیا۔

مٹی خود کو پہچانتی ہے۔ ایک ایک ذرّہ کو کوکھ سے وابستہ رکھتی ہے۔ مٹی کو اگر فرد مان لیا جائے تو مٹی سے بنی ہوئی ہر چیز مٹی کے اعضا ہیں۔ تانبا، لوہا، آکسیجن، نائٹروجن، ہائیڈروجن، ہیلیم، کاربن، یورینیم، چاندی، سونا وغیرہ مٹی کے وہ اعضا ہیں جن پر مٹی کا تشخص قائم ہے۔ آدمی کا جسم بھی مٹی سے بنا ہوا ہے لیکن آدمی چوں کہ اللہ تعالیٰ کی امانت کا امین ہے اس لئے مٹی آدمی کو دوسرے اعضا کے مقابلہ میں اپنا قلب سمجھتی ہے اور جب قلب متاثر ہوتا ہے تو جسم ناکارہ ہو جاتا ہے۔ مفلوج اور ناکارہ جسم زمین پر بوجھ ہے۔

کون نہیں جانتا کہ آدمی پچاس کمروں کا مکان بنا لے لیکن سوئے گا وہ ایک چارپائی کی جگہ۔ چاہے تو ہوس زر میں سونے چاندی (مٹی کے ذرّات) سے خزانے بھر

لے لیکن پیٹ دو روٹی سے بھرتا ہے۔ ماحول کو مصنوعی روشنی اور خوش بوؤں سے معطر کر لیا جائے مگر یہ آدمی کے اندر کی سڑاند کا نعم البدل نہیں۔

زمین کی فطرت ہے کہ وہ اپنی اولاد کو صاف ستھرا دیکھنا چاہتی ہے اور صاف ستھرا رکھتی ہے۔ جب اولاد تعفن سے نہیں نکلنا چاہتی تو وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتی ہے اور اس ادبار کی وجہ سے آدمی گھناؤنا اور ناسور زدہ ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ کسی شخص کے لئے اس سے بڑا اور دردناک عذاب کوئی نہیں۔

''اور وہ لوگ جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کے لئے خرچ نہیں کرتے، ان کے لئے عذاب الیم کی بشارت ہے۔'' (التوبہ: ۳۴)

صدیوں سے زمین پر ہونے والی تبدیلیاں اس بات کی شہادت فراہم کرتی ہیں کہ زندگی کے ادوار، زمانہ کے نشیب و فراز اور سائنسی ایجادات زمین کے سینہ میں محفوظ ہیں۔ زمین جانتی ہے کہ کتنی تہذیبوں نے اس کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور پھر یہ تہذیبیں زمین دوز ہو کر صفحۂ ہستی سے غائب ہو گئیں۔

خلا کے پار آسمان کی وسعتوں میں دیکھا جائے تو لگتا ہے کہ زمین کے باسیوں کا اپنی ذات سے فرار اور منفی طرزِ عمل دیکھ کر نیلے پربت پر جھل مل کرتے ستاروں کی شمع امید کی لو مدھم پڑ گئی ہے۔ اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ کرنے والا آدمی کیا ذہنی اعتبار سے حیوانات سے بدتر زندگی نہیں گزار رہا؟ حقیقت یہ ہے کہ فی الوقت جو سکون بلی اور بکری کو حاصل ہے، اس کا عشر عشیر بھی آدمی کو میسر نہیں۔

زمین کا ظاہری جسم اور اس جسم میں نشو و نما پانے والی ہر شے مٹی ہے۔ زمین کو قدرت نے اتنا سخت نہیں بنا دیا کہ آدم زاد اس پر چل نہ سکے۔ اتنا نرم نہیں بنایا کہ آدم زاد کے پیر زمین میں دھنس جائیں۔ اسے زمین پر تصرف کا اختیار ہے۔ لاکھوں کروڑوں سال پہلے کے آدم کی طرح آج بھی آدم زاد زمین کے سینہ پر کھیتی باڑی میں مصروف ہے اور زمین کے سینہ پر ہل چلا کر گھاؤ ڈال رہا ہے۔ کھیتی کا ہر جزو آدم کی طرح مٹی ہے اور جو کچھ آدمی بوتا ہے، اس کا بیج بھی مٹی ہے۔

آدمی جانتا اور کہتا ہے کہ زمین پر زندگی کا وقفہ محدود ہے لیکن اس کا عمل قول اور مشاہدہ کے خلاف ہے۔ وہ پوری زندگی ان خطوط پر گزارتا ہے جو قانون فطرت کے برعکس ہے۔ تخریب کا نام آدمی نے ترقی رکھ دیا ہے۔

نوع آدم قدرت کی دی ہوئی صلاحیتوں کی امین ہے لیکن اس نے ان صلاحیتوں کو حرص و ہوس، خود غرضی، انا پرستی اور خود نمائی جیسے جذبات کی تسکین کے لئے اپنی ذات تک محدود کر دیا ہے، جانتے ہوئے کہ فانی دنیا کے اعمال بھی فانی ہیں۔ اگر اعمال میں تعمیر ہے تو اعمال یہاں اور آخرت میں جزا ہیں۔ اگر اعمال میں تخریب ہے تو اس دنیا اور آخرت میں سزا ہے۔ کانٹے بونے والا کانٹے کاٹتا ہے اور تعمیری ذہن فلاح پاتا ہے۔

سید اسد علی

بھولے خان

گہری گہری سانسیں لیں اور مراقبہ کے انداز میں بیٹھ گئے۔ ہم اس انتظار میں تھے کہ اب خیال ہمارے ذہن پر وارد ہوگا۔ نہیں معلوم مشرق سے آئے گا یا مغرب سے نزول کرے گا — کچھ دیر بعد خراٹے سنائی دیئے اور ہم دبے قدموں اٹھے۔

ایک بار میں نے کسی جریدہ کے لئے ٹیلی پیتھی کے موضوع پر مضمون لکھا تھا۔ اِس مضمون کی نوعیت سمجھنے کے لئے پہلے اُس مضمون کا خلاصہ پڑھیں۔

ٹیلی پیتھی خیالات کی منتقلی کا علم ہے جس میں لہروں کا علم حاصل کیا جاتا ہے۔ روزمرہ زندگی میں اس کی کئی مثالیں ہیں۔ جیسے کہ بچہ بھوکا ہے، رو کر بھوک کا اظہار کرتا ہے اور ماں سمجھ جاتی ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ گونگا آدمی ہونٹوں کی خفیف جنبش سے سب کچھ کہہ دیتا ہے اور سمجھنے کے اہل افراد گونگے فرد کے دل کا حال اور احساسات سمجھ لیتے ہیں۔ انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ جو افراد گونگے نہیں ہیں، وہ بھی خاموش رہ کر ایک دوسرے کے حال سے مطلع ہوتے ہیں۔

جانور آواز کے بغیر ایک دوسرے کو اپنے حال سے مطلع کرتے ہیں۔ روحانی ہستیاں بتاتی ہیں کہ درخت آپس میں گفتگو کرتے ہیں حتیٰ کہ یہ گفتگو صرف آمنے سامنے کے درختوں میں نہیں ہوتی، ایسے درختوں میں بھی ہوتی ہے جو ہزاروں میل دور ہیں۔ کنکر، پتھر اور ذرّات خیالات کی لہریں منتقل اور وصول کرتے ہیں۔ یہ سب ٹیلی پیتھی کی مثالیں ہیں اور ہمارے معمولات میں شامل ہیں۔

علمی توجیہ یہ ہے کہ کائنات میں ہر شے کا قیام لہروں پر ہے۔ بالفاظ دیگر زندگی لہروں پر رواں ہے اور لہروں سے مخلوقات تخلیق ہوتی ہیں۔

عموماً اس علم کو سیکھنے کی خواہش رکھنے والوں کا مقصد دنیاوی فائدے حاصل کرنا ہے تاکہ وہ ٹیلی پیتھی کے ذریعے اپنے معمول (متعلقہ فرد) کو متاثر کریں۔ چند حضرات اس علم کو اس لئے بھی سیکھتے ہیں کہ وہ اللہ کی مخلوق کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔

مثال کے طور پر وہ مریض کے ذہن میں صحت مند خیالات منتقل کر کے بیماری سے نجات دلانے میں مدد کرتے ہیں۔ جس طرح ایک آدمی دوسرے آدمی سے

ذہنی رابطہ قائم کر کے اپنا پیغام پہنچا سکتا ہے، اسی طرح بیماریوں سے بھی ذہنی رابطہ قائم کر کے انہیں پیغام دیا جاتا ہے کہ وہ مریض کو چھوڑ دیں کیوں کہ بیماریاں باشعور اور بااختیار ہیں۔

ٹیلی پیتھی سے متعلق مضمون میں ایک پروفیسر صاحب کا تذکرہ کیا گیا تھا جو میرے دوست ہیں اور کم لوگ واقف ہیں کہ وہ ٹیلی پیتھی جانتے ہیں۔

خلاصہ پڑھنے کے بعد اب مضمون پڑھئے۔

ایک شام اپنے دوست ناصر جیلانی کے ساتھ میں پروفیسر صاحب کے گھر گیا۔ ناصر بھائی ماورائی علوم سے ناواقف تھے اس لئے مخالف تھے۔ باتوں باتوں میں ذکر ٹیلی پیتھی کا آیا تو ناصر بھائی گویا ہوئے، پروفیسر صاحب! ماورائی علوم دراصل شعبدہ بازی اور تخیل (imagination) کا کمال ہے۔ سیدھے سادے لوگ بے وقوف بن جاتے ہیں۔

پروفیسر صاحب تحمل مزاجی سے مسکرائے اور کہا، ناصر صاحب! ماورائیت کے بغیر زندگی — زندگی نہیں۔ آنے والا ہر لمحہ مادی آنکھوں سے اوجھل ہے اور گزرنے والا وقت بھی مادیت کے بس میں نہیں۔ جب تک بندہ کو ماورائی ہستی کی خوش بو حاصل نہ ہو، دل بے قرار رہتا ہے۔ الہامی کتابیں تصدیق کرتی ہیں کہ لہر یا خیال ہمارے اندر حرکت کا سبب ہے۔

پروفیسر صاحب سے کہا، کوئی مظاہرہ ہونا چاہئے۔

انہوں نے کاغذ لیا، اس پر کچھ لکھا اور لپیٹ کر میز پر رکھ دیا۔ ایک بار پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ ایک مرحلہ پر پروفیسر صاحب بولے، ناصر بھائی! زحمت نہ ہو تو سامنے کمرے سے میز پر رکھا گل دان لے آئیں۔

ناصر بھائی کمرے میں گئے اور کچھ دیر میں گل دان لے کر آ گئے۔ پروفیسر صاحب نے پوچھا، آپ نے کمرے کی لائٹ کیوں نہیں جلائی؟

ناصر بھائی بولے، کیسے پتہ کہ میں نے لائٹ نہیں جلائی۔ کیا آپ میرے پیچھے آئے تھے؟

پروفیسر صاحب نے نفی میں گردن ہلائی اور سامنے موجود میز پر کاغذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، کھول کر بآواز بلند پڑھیں۔

ناصر بھائی نے کاغذ پر تحریر پڑھی۔ لکھا تھا،

''ناصر بھائی کمرے میں گل دان اٹھانے جائیں گے لیکن لائٹ نہیں جلائیں گے۔''

ناصر بھائی نے کہا، لائٹ کا بٹن نظر سے گزرا لیکن معلوم نہیں کہ میں نے لائٹ کیوں نہیں جلائی!

قارئین! کچھ لوگوں نے مضمون کی بہت پذیرائی کی پھر ایک واقعہ پیش آیا۔

ایڈیٹر صاحب ادارت میں مشغول تھے۔ آج وہ مقررہ وقت سے پہلے آ گئے تھے تاکہ نامکمل کام مکمل کر لیں۔ رسالہ کی تاریخ قریب آ رہی تھی، کئی مضامین اور کہانیوں کی نوک پلک سنوارنا تھی۔

ہفتہ کا پہلا دن، موسم سہانا اور خوب صورت تھا۔ بادلوں کی وجہ سے دھوپ کی تپش کم ہوگئی تھی۔ پنکھا حسب معمول چل رہا تھا۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ تحقیق اور تحریر کے لئے بطور خاص یک سوئی درکار ہوتی ہے۔ رسالہ کا دفتر پرسکون مقام پر واقع تھا۔ ٹریفک کا شور وغل نہ آس پاس کاروباری سرگرمی۔ البتہ معلوم ہوتا تھا کہ آج خلاف معمول کچھ ہونے والا ہے جیسے در و دیوار کو کسی کے آنے کا انتظار ہو۔

دس بجے ایڈیٹر صاحب صبح کی چائے پی کر ایک بار پھر ادارت کی طرف متوجہ ہوئے تو چوکیدار نے اطلاع دی کہ بہاولپور سے ایک صاحب آئے ہیں اور نام بھولے خان بتاتے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

ایڈیٹر صاحب بولے، اچھا بلاتے ہیں۔ پھر مضمون کی نوک پلک سنوارنے میں مصروف ہوگئے۔

چوکیدار پھر آیا۔ صاحب جی! وہ صاحب آپ کا انتظار کررہے ہیں اور جلدی ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔

اوہو۔۔۔ میں تو بھول گیا تھا، اچھا انہیں بھیجو۔

کلف لگے سفید لباس میں ایک شخص داخل ہوا۔ بالوں میں تیل لگا کر سلیقہ سے کنگھی کی گئی تھی۔ باآواز بلند سلام کیا اور ہاتھ جوڑ لئے۔

ایڈیٹر صاحب نے کہا، تشریف رکھیں۔

بھولے خان کرسی پر بیٹھ گئے اور بغیر تمہید کے کہنا شروع کیا، آپ کو آپ کے ماں باپ، بچوں اور عزیز ترین لوگوں کا واسطہ، میری مدد کریں۔

بھائی خیریت ہے، مسئلہ بتائیں۔

بھولے خان کرسی سے اٹھا، ایڈیٹر صاحب کے پیر پکڑ لئے اور وہیں بیٹھ گیا۔ پہلے روتی صورت بنائی، آہوں اور سسکیوں کی آواز آئی پھر زاروقطار رونا شروع کردیا اور بتایا، دو بڑے مسئلے ہیں، اللہ کے واسطہ حل کریں۔

ایڈیٹر صاحب ناگہانی صورت حال سے پریشان ہوگئے اور بولے، میں ڈاکٹر ہوں نہ مجھے ٹوٹکے آتے ہیں۔ مسئلہ بتائیں میں اپنی بساط کے مطابق حل کرنے کی کوشش کروں گا۔ پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے پانی ایک سانس میں پی لیا۔

میں بہاولپور سے سفر کرکے اس لئے آیا ہوں کہ میری آپ سے ایک التجا ہے۔

ایڈیٹر صاحب: وہ کیا؟

بھولے خان: آپ کے رسالہ میں ٹیلی پیتھی پر مضمون شائع ہوا تھا۔ اس میں پروفیسر صاحب کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ ان کا نام اور پتہ بتا دیں۔ ان سے مل کر اپنے مسائل حل کرانا چاہتا ہوں۔

ایڈیٹر صاحب بولے، دیکھئے مضمون میں لکھا تھا کہ پروفیسر صاحب نے منع کیا ہے کہ ان کا نام اور پتہ نہ بتایا جائے۔ ہم کیسے بتا دیں۔ یہ سننا تھا کہ بھولے خان نے روتے ہوئے سر پیٹنا شروع کردیا۔

ایڈیٹر صاحب نے انہیں بڑی مشکل سے کرسی پر بٹھایا اور کہا، میرے بھائی! مسئلہ بتائیں ممکن ہے کہ ان کے بغیر حل نکل آئے۔ لیکن بھولے خان راضی نہ

ہوئے اور پروفیسر صاحب سے ملاقات کے لئے اصرار کرتے رہے۔کئی گھنٹے گزار کر بڑی مشکل سے تشریف لے گئے۔ایڈیٹر صاحب نے سکون کا سانس لیا۔

اگلے دن عین دس بجے بھولے خان پھر آ گئے۔ہاتھ جوڑ کر کہتے رہے کہ نمبر دے دو۔تھک ہار کر کہا، اچھا جس نے مضمون لکھا ہے اس کا نمبر دے دو۔وہ میری مدد کریں گے۔یہ سلسلہ کم وبیش ایک ہفتہ جاری رہا۔

آخر تنگ آ کر ایڈیٹر صاحب نے مجھے فون کیا اور صورت حال بتائی — بھائی اسد! میں بھولے خان سے تنگ آ گیا ہوں۔کیا انہیں آپ کا نمبر دے دوں؟

میں نے بادل نخواستہ ہاں کہہ دیا۔

شام کو آفس سے گھر پہنچا تو فون کی گھنٹی بجی، مخاطب نے بتایا کہ وہ بھولے خان ہے۔نمبر فلاں نے دیا ہے۔آپ کے مضمون نے بہت متاثر کیا اور مجھے بہاولپور سے کراچی لے آیا۔

میں نے مضمون پسند کرنے پر شکریہ ادا کیا۔

بھولے خان: مجھے وقت دیں، ملنا چاہتا ہوں۔ انتہائی تکلیف سے دوچار ہوں۔

بھولے خان کو وقت دیا اور ایک ہوٹل پر ملاقات ہوئی۔کلف لگے کپڑے پہنے تھے اور تیل لگا کر بال خوب جمائے تھے۔بیٹھتے ہی حسب عادت واسطے دینا شروع کئے۔کئی منٹ تک واسطے دیتے رہے۔میں نے مشکل سے راضی کیا کہ مدعا بیان کریں۔

درد بھری آواز میں بولے، دو بڑے مسئلے ہیں۔مجھے ٹیلی پیتھی کے ماہر پروفیسر کا پتہ بتائیں۔ان سے ملوں گا وہ ٹیلی پیتھی کی طاقت سے مسائل حل کر دیں گے۔

میں نے کہا، پروفیسر صاحب کا تذکرہ اس شرط پر کیا گیا تھا کہ نام اور پتہ راز میں رکھا جائے گا۔

چار و ناچار وہ مسئلہ بتانے پر رضامند ہوئے۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میری آدھی زمینوں پر چچا زاد بھائیوں نے قبضہ کر لیا ہے۔چاہتا ہوں کہ پروفیسر صاحب ٹیلی پیتھی کی طاقت سے چچازاد بھائیوں کا دماغ الٹ دیں تاکہ قبضہ ختم ہو جائے۔

میں نے بھولے خان کو سمجھایا، اگر ایسا ہوتا تو لوگ محنت مشقت کرنا چھوڑ دیتے، امتحان پاس کرنے، عہدہ حاصل کرنے اور تمغے لینے کے لئے ٹیلی پیتھی جاننے والے حضرات کی خدمات حاصل کرتے۔دیکھئے بھولے صاحب! ہر کام کا قاعدہ اور اصول ہوتا ہے۔ٹیلی پیتھی جاننے والا اس طرح لوگوں کے مسئلے نہیں حل کرتا۔آپ کا مسئلہ مل بیٹھ کر صلح صفائی یا پھر بات چیت سے حل ہوگا۔اللہ کا شکر ہے کہ ان کو میری بات کچھ سمجھ میں آئی۔ کچھ دیر سوچ میں گم رہے پھر بولے، میں نے بھی ٹیلی پیتھی سیکھنے کی کوشش کی ہے۔

میں نے حیرت اور اشتیاق سے پوچھا، کیا آپ نے اس کی مشقیں کی ہیں؟

بھولے خان: گھنٹوں شمع بینی کی مشق کرتا تھا۔

اور نتیجہ کیا نکلا؟ بے تابی سے پوچھا۔

بھولے خان افسردگی سے: بے نتیجہ رہا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ کچھ مہینوں بعد مجھے اسپتال میں داخل کیا گیا کیوں کہ ناک سے خون آنا شروع ہو گیا تھا۔ اللہ کے کرم سے شفا ہوئی ورنہ حالت بگڑ گئی تھی۔ لیکن جی! میں پھر بھی نہیں رکا۔ وظائف پڑھنا شروع کر دیئے۔

تجسس سے پوچھا، اس سے کیا ہوا؟

بھولے خان نے بتایا، ہر طرف سائے نظر آنا شروع ہو گئے۔ جہاں جاتا سائے ساتھ ساتھ ہوتے۔ میں ڈر گیا۔ کپکپی طاری ہونا شروع ہوئی۔ خوف کی وجہ سے کئی ماہ گھر میں گزارے۔

بھولے خان کو سمجھایا کہ وظائف اور مشقیں ماہر استاد کی نگرانی میں کرنی چاہئیں ورنہ فائدہ کے بجائے نقصان ہوتا ہے۔ بچہ کیمیائی تجربہ گاہ (لیبارٹری) میں چلا جائے جہاں انواع و اقسام کے کیمیکل رکھے ہوں۔ بچہ ان کو ملانا شروع کر دے تو لاعلمی میں ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ وظیفہ اگر استاد کی نگرانی میں نہ پڑھا جائے تو دماغ الٹ جاتا ہے۔ ساری عمر کے لئے!

بھولے خان نے اس بات کو قطعی سنجیدگی سے نہیں لیا اور انکشاف کیا، چھوٹے موٹے خیالات میں بھی منتقل کر سکتا ہوں۔

میں مسکرا دیا اور دل رکھنے کے لئے پوچھا، وہ کیسے؟

بھولے خان: ابھی آپ کے ذہن میں خیال بھیجتا ہوں۔ بس دیکھتے جایئے۔ گہری گہری سانسیں لیں اور مراقبہ کے انداز میں بیٹھ گئے۔ ہم اس انتظار میں تھے کہ اب خیال ہمارے ذہن پر وارد ہوگا۔ نہیں معلوم مشرق سے آئے گا یا مغرب سے نزول کرے گا لیکن ایسا کچھ نہ ہوا— کچھ دیر بعد بھولے خان کے خراٹے سنائی دیئے اور ہم دبے قدموں اٹھے۔ اس لئے نہیں کہ ان سے ڈر گئے تھے بلکہ اس لئے کہ کسی کو بے آرام نہیں کرنا چاہئے۔ آخر انسانیت بھی کوئی چیز ہے۔

آہستگی سے کاؤنٹر پر گئے، بل ادا کیا اور کاؤنٹر پر موجود صاحب کو سنجیدگی کے ساتھ نصیحت کی کہ انہیں کچھ دیر سونے دیں، نہیں معلوم کب سے جاگے ہوئے ہیں۔

اور میں گھر آ گیا۔

کچھ دن بعد بھولے خان کا پھر فون آیا۔ انہوں نے منت سماجت کر کے ملاقات کی خواہش کی۔ میں نے نہ جانے کیا سوچ کر ملاقات کی ہامی بھر لی۔

بھولے خان نے چائے پیتے ہوئے کہا، میرا دوسرا مسئلہ پہلے مسئلہ سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔

میں نے پوچھا، کیسے؟

بھولے خان: کیا آپ جانتے ہیں کہ میرے ذہن میں خیالات گرتے ہیں؟

مجھے بات سمجھ میں نہیں آئی اور خود سے کہا، یہ تو بھولا ہے لیکن کیا تم بھی بھولے ہو جو پھر آ گئے؟

میں نے سوالیہ انداز میں اس کے جملہ کو دہرایا، آپ کے ذہن میں خیالات گرتے ہیں—؟

بھولے خان: جی ہاں!

پھر مثال کا سہارا لیا اور بولے، اسد بھائی! کیا آپ نے نلکے سے پانی گرتے دیکھا ہے؟

میں: بالکل دیکھا ہے۔

بھولے خان: جب پانی کم ہوتا ہے تو اس وقت نلکے سے ٹپ ٹپ ٹپ کر کے گرتا ہے۔ اسی طرح میرے ذہن میں خیالات گرتے ہیں۔

سنجیدگی سے مشورہ دیا کہ اس مسئلہ کے حل کے لئے آپ کو ماہر نفسیات سے ملنا چاہئے۔ خیال تھا کہ وہ میری بات کا برا منا سکتے ہیں لیکن انہوں نے برا نہیں منایا اور مطلع کیا کہ میں پورے پاکستان کے ماہرین نفسیات سے مل چکا ہوں مگر کوئی بھی میرے ذہن میں ٹپ ٹپ کر کے گرتے ہوئے خیالات کو روک نہیں سکا۔ میری بیماری کا علاج صرف پروفیسر صاحب کے پاس ہے۔ وہ ٹیلی پیتھی کی طاقت سے خیالات روک دیں گے۔

میں نے قہقہہ لگایا کہ یہ گھوم پھر کر وہیں آ گئے۔

بہت سمجھایا مگر ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ مشکل سے انہیں بہاولپور واپس جانے پر رضامند کیا۔

مقررہ دن ہم خود انہیں اسٹیشن چھوڑنے گئے کہ واپس نہ آ جائیں۔ ان کو بتایا کہ پروفیسر صاحب ملک سے باہر چلے گئے ہیں، وہ واپس آئے تو آپ کی ملاقات کی خواہش کا ان سے تذکرہ کریں گے، ان کی رضامندی پر ملاقات ضرور کرائی جائے گی۔ ٹرین چلی تو بھولے خان کھڑکی سے ہاتھ نکال کر دیر تک ہاتھ ہلاتے رہے۔

قارئین! مضمون کا لب لباب یہ ہے کہ ماورائی علوم سے متعلق پڑھ کر شارٹ کٹ کی تلاش میں رہنا چھوڑ دیں۔ شارٹ کٹ کا نتیجہ مختصر عرصہ کے لئے ہوتا ہے اور نہیں ہوتا۔ خیالی پلاؤ پکانے کی عادت چھوڑ کر حقیقت پسند بنیں اور علم کی اہمیت کو سمجھیں۔ کیا مادی علوم آپ اسی طرح حاصل کرتے ہیں جیسے ماورائی علوم سیکھنا چاہتے ہیں—؟

ہم امید کرتے ہیں کہ اس کہانی کو پڑھنے کے بعد کوئی پروفیسر صاحب کا نام پتہ یا فون نمبر معلوم کرنے کے لئے ادارہ یا مضمون نگار سے رابطہ نہیں کرے گا—اور اگر کسی نے جرأت رندانہ اور جسارت بے باکانہ کی تو ہم بھی پوچھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ

''کیا آپ کے ذہن میں بھی خیالات گرتے ہیں؟''

سوال یہ ہے کہ

ہم جب کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اس چیز کی سختی یا نرمی کا علم ہو جاتا ہے حالاں کہ وہ چیز دماغ سے ٹکراتی نہیں ہے۔ غور طلب ہے کہ شعاع یا لہر اپنے اندر سختی رکھتی ہے نہ وزن۔ پھر ہمیں یہ علم کیسے ہوتا ہے فلاں چیز سخت ہے اور فلاں چیز نرم ہے—؟

گھر آیا تو.....؟؟؟

بیوی دکھ سے مسکراتے ہوئے بولی، مجھے چھوڑ کر اس کے پاس گئے، اب اسے چھوڑ کر میرے پاس آئے ہو—؟ الفاظ گم ہو گئے۔ ندامت سے آہستہ آواز میں اتنا کہہ سکا کہ پتہ نہیں یہ سب مجھ سے کیسے ہو گیا۔

150 سال قبل تک جاپان میں حکم رانوں اور با اثر افراد کے محافظوں کو سامورائی کہتے تھے۔ ان کا تعلق جنگجوؤں کے اعلیٰ خاندان سے تھا۔ یہ جنگجوؤں کے لئے مخصوص طریق ''بشیڈو'' پر زندگی گزارتے تھے یعنی مالک سے وفاداری، نظم وضبط، باوقار رہنا اور ہر حال میں تابع داری۔

جب مالک مرجاتا تو وفاداری ظاہر کرنے کے لئے سامورائی اپنی جان لینے کا انتہائی قدم اٹھاتے تھے۔ اس رسم پر پابندی لگی تو اس وقت ایسے سامورائی بھی تھے جو خود کو مارنے سے دریغ نہ کرتے۔ جوڈو کراٹے، مراقبہ اور کینڈو جیسی مشقیں ان کی تربیت کا اہم حصہ تھیں۔ یہ مشقیں آج بھی جاپان میں سکھائی جاتی ہیں۔

سامورائی لفظ عموماً مردوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے لیکن چند خواتین بھی سامورائی رہ چکی ہیں۔ ان میں Tomoe Gozen بہت مشہور ہوئیں۔ بہادری، گھڑسواری اور تلوار بازی میں ماہر اس خاتون کا اپنے وقت کی بہترین جنگجوؤں میں شمار ہوتا تھا۔

1868ء میں جاگیردارانہ نظام کے خاتمہ کے ساتھ سامورائی طرز زندگی کا بھی اختتام ہوا۔ بیش تر سامورائی بیوروکریسی، تدریس اور فنون لطیفہ کے شعبہ سے وابستہ ہو گئے۔ آج بھی ان کی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ان کی نسل کی عزت کی جاتی ہے۔

قصہ ایک بے روزگار سامورائی کا ہے۔ ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے نوبت فاقوں تک پہنچ گئی۔ بیوی نے مشورہ دیا کہ تم اپنے ہنر میں یکتا ہو، مایوس مت ہو، ایک بار پھر جاگیرداروں کے پاس جاؤ اور ان سے بات کرو، انہیں سامورائی اور تمہیں آقا کی ضرورت ہے۔

اس نے یہ بھی کر کے دیکھ لیا لیکن ناکامی ہوئی۔

ایک دوست ملاقات کے لئے گھر آیا۔ حالات دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ مدد کی ضرورت ہے۔ اس نے کہا، جانتے ہو کہ تمہارا فلاں دوست ایک علاقہ میں حاکم مقرر ہوا ہے اور جلد یہاں سے رخصت ہو کر نیا عہدہ سنبھال لے گا۔

واہ! کیا سچ کہہ رہے ہو؟ سامورائی بہت خوش ہوا کیوں کہ جس دوست کا تذکرہ کیا گیا تھا وہ اچھے رفقا میں سے تھا مگر مصروفیت کی وجہ سے رابطہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ بیوی بولی کہ دوست کا حاکم مقرر ہونا ہمارے لئے امید کی کرن ہے۔ وہ یقیناً تمہاری مدد کرے گا۔

سامورائی کی آس بندھی اور دوست کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں پہنچا تو وہ سفر کے لئے ضروری سامان رکھتے ہوئے ملازموں کو ہدایات دے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر پرتپاک استقبال کیا اور گلے لگاتے ہوئے بولا، بہت خوشی ہوئی کہ تم آئے اور اچھے وقت پر آئے ہو، پتہ نہیں پھر ملاقات کب ہو۔ شان دار نوکری ملی ہے۔

سامورائی بولا، خبر مل چکی ہے اس لئے مبارک باد دینے آیا ہوں۔

دوست نے پوچھا، تمہاری ملازمت کہاں ہے؟

بے روزگار ہوں۔ ہر ممکن کوشش کر لی لیکن جہاں جاتا ہوں بات نہیں بنتی۔ ہنر ہے اور تجربہ بھی، لگتا ہے کہ قسمت ساتھ نہیں۔ اب ہمت جواب دینے لگی ہے۔

دوست فکر مندی سے بولا، میرا مشورہ مانو اور ساتھ چلو۔ اس شہر میں دال گلنی مشکل ہے۔

سامورائی کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ پُرجوش آواز میں بولا، امید تھی کہ تم کوئی راستہ ضرور دکھاؤ گے۔

دوست بولا، تمہاری لئے نوکری کی کوشش کروں گا۔

بہت شکریہ میرے دوست۔ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا میں کس کرب سے گزر رہا ہوں۔ بیوی نے بہت ساتھ دیا، افلاس کے باوجود حرف شکایت زبان پر نہیں لائی۔ نیک اور صابر عورت ہے، کوئی مطالبہ نہیں کرتی بلکہ ڈھارس بندھاتی ہے۔ اسی نے تمہارے پاس بھیجا۔ اسے یہاں اکیلا کیسے چھوڑ دوں؟

دوست مسکرایا اور بولا، ایسی بیوی قسمت والے کو ملتی ہے۔ بس اس کی خوشی کے لئے یہ علاقہ چھوڑو اور ساتھ چلو! حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو اسے بھی بلا لینا۔

سامورائی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد ہامی بھر لی۔

گھر پہنچ کر بیوی کو خوش خبری سنائی۔ فرط مسرت سے چہرہ سرخ ہو گیا لیکن جب معلوم ہوا کہ دوسرے شہر جانا ہے تو سرخی کی جگہ زردی نے لے لی اور دل پر بھاری بوجھ آ گیا۔ سامورائی بھی افسردہ تھا۔ ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ سمجھایا کہ میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں، اس طرح زندگی نہیں گزر سکتی، میں چاہتا ہوں تم بہترین زندگی گزارو کسی شے کی کمی نہ ہو۔ حالات بہتر ہوتے ہی واپس آ جاؤں گا یا تمہیں بلا لوں گا۔

بیوی حسین ہونے کے ساتھ سمجھ دار اور صابرہ تھی۔ کہا، حالات پر پہلے اختیار تھا نہ اب ہے۔ میں تمہاری منتظر رہوں گی۔ یہ کہہ کر مزید ضبط نہ کر سکی اور چہرہ پر آنسو موتی بن گئے۔

جانے سے پہلے بیوی کو کچھ خرچ دینا چاہتا تھا لیکن ادھار رقم دینے پر کوئی راضی نہ تھا اور سفر کے لئے بھی رقم درکار تھی۔ دوست سے مانگنا اچھا نہیں لگا۔ نوکری میں

مدد کے بعد مزید مدد مانگنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

پیسوں کے بندوبست کی کوشش میں ایک امیر عورت سے ملاقات ہوئی۔ اس نے پیشکش کی کہ اگر مجھ سے شادی کرلو تو تمہارے دن پھر جائیں گے۔ میں تمہارے ساتھ دوسرے شہر چلی جاؤں گی اور پہلی بیوی یہیں رہے گی۔ سامورائی کے دل نے تنبیہ کی کہ ایسا بالکل نہیں کرنا۔ لیکن نہ جانے ذہن میں کیا آیا کہ اس نے شرط مان لی اور شادی پر راضی ہوگیا۔

رخصت ہونے سے پہلے وفادار بیوی کو خرچ کے لئے پیسے دیئے اور نئی بیوی کے ساتھ روانہ ہوگیا۔

دوست کے توسط سے نئے شہر میں اچھی ملازمت ملی اور دن بدل گئے۔ دوسری بیوی امیر کبیر تھی— لیکن اس نے کوشش کی کہ مزید احسان لئے بغیر اپنے بل بوتے پر پہلی بیوی کو پیسے بھیجے۔ مفلسی کی زندگی سے آرام دہ زندگی کے سفر میں وہ غربت کے دن بھول گیا اور یہ بھی یاد نہیں رہا کہ کوئی اس کا منتظر بھی ہے۔ خط لکھا نہ ابتدائی چند مہینوں کے بعد پیسے بھیجے۔ دولت کے خمار میں پہلی بیوی کا ایثار بھول گیا کہ کس طرح اس نے اس کا قدم قدم پر ساتھ دیا— اس وقت جب اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ دوسری بیوی کا گرویدہ کیا ہوا کہ پہلی بیوی کی موجودگی وقت گزرنے کے ساتھ غیر محسوس ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اسے فراموش کردیا۔

سالوں گزر گئے۔ ایک روز تنہا بیٹھا سوچوں میں گم تھا کہ پہلی بیوی کی تصویر آنکھوں کے سامنے آئی جیسے وہ جیتی جاگتی سامنے کھڑی ہو۔ یک دم شرمندگی نے آگھیرا اور بے وفائی کا احساس ہوا۔ میں نے اسے لاوارث چھوڑ دیا۔ نہ جانے کس حال میں ہوگی۔ ایک پیسہ نہیں بھیجا۔ میں یہاں عیاشی کررہا ہوں اور اس کا کوئی پرسان حال نہیں۔ کتنا مان تھا اسے مجھ پر— ندامت بڑھی اور دل بھاری ہوگیا۔ گھر واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ ضروری سامان لیا اور دوسری بیوی کو بتائے بغیر چند روز میں آبائی گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

وہ پورا راستہ اپنے آپ سے لڑ رہا تھا کہ یہ میں نے کیا کردیا۔ اسے کیا تاویل دوں گا۔ بہانہ تراشتا اور رد کردیتا۔ آخر فیصلہ کیا کہ اس کے قدموں میں بیٹھ کر اعتراف جرم کروں گا اور معافی مانگوں گا۔ وہ معاف کردے گی۔ اب اسی کے ساتھ رہوں گا۔ دوبارہ چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔

گھر پہنچا تو گہری پُراسرار خاموشی تھی جیسے گھر نہیں ویرانہ ہو۔ وہ مکان جہاں مفلسی کے دن گزارے تھے خستہ حال ہوگیا تھا۔ مرکزی دروازہ زنگ آلود ہوچکا تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی اور ہوا کے تھپیڑوں سے دروازہ بج رہا تھا۔ اردگرد جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔ لگتا تھا کہ یہاں برسوں بعد کوئی آیا ہے۔

سامورائی نے ہمت مجتمع کی اور اندر داخل ہوا۔ وہ

صحن جو کبھی ہری بھری گھاس، رنگ برنگے پھولوں اور دل فریب نقش و نگار کی تتلیوں کا مسکن تھا — وہاں جگہ جگہ سوکھی جھاڑیاں تھیں۔ دل بھر آیا۔ تیزی سے مکان کے اندر داخل ہوا۔

چاند کی چودھویں تاریخ تھی۔ سمندر کی تیز بپھری موجوں کی طرح اس کے اندر بھی جذبات میں تلاطم تھا۔ خاموشی میں جھینگروں کی آواز کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔ دروازہ کے پاس رک کر وہ تھوڑی دیر خاموش کھڑا رہا — کھٹکھٹایا — اندر سے آواز آئی تو خود کو روک نہ سکا اور دروازہ کو دھکا دیتے ہوئے گھر میں داخل ہو گیا۔ گھپ اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا۔ دیواروں کو ٹٹولتا ہوا کمرے میں گیا تو کسی چیز سے پیر ٹکرایا اور وہ اچھلتی ہوئی دور جا گری — اسٹیل کا برتن تھا جس سے ماحول میں تھوڑی دیر کے لئے شور برپا ہوا اور پھر وہی — وحشت ناک خاموشی۔

دوسرے کمرے میں گیا تو اس کے قدم لرز گئے۔ ہمت جواب دے گئی۔ گھپ اندھیرے میں سامنے بیوی بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ بولنے کا یارانہ تھا۔

بیوی نے سامورائی کو دیکھا، مشکل سے بول پائی۔ لہجہ میں شدید نقاہت تھی۔

''خوش آمدید میرے ہر دل عزیز شوہر! بہت انتظار کروایا۔ کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب تمہیں یاد نہ کیا ہو، ایک پل کے لئے نہیں بھولی لیکن تم نے تو پلٹ کر خبر تک نہ لی۔ کیا میں یاد نہیں آئی —؟''

یہ کہتے ہوئے چہرہ پر عجیب مسکراہٹ تھی۔

سامورائی لرز گیا۔ خیال تھا کہ بیوی اسے دیکھتے ہی لڑے گی، گھر میں داخل نہیں ہونے دے گی، نفرت کا اظہار کرے گی لیکن اظہار محبت سن کر نظریں نہ ملا سکا۔

قدموں میں بیٹھا اور معافی مانگی۔ کم ظرفی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ غلطیوں کا ازالہ کرنے آیا ہوں۔ اب چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ مجھے معاف کر دو۔

نظر اٹھا کر دیکھا تو بیوی اسی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی لیکن اب زرد چہرہ پر مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

یہ دیکھ کر ہمت بڑھی اور اس نے کہا، جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ سب کچھ چھوڑ کر آیا ہوں۔ اس زندگی کو خیر باد کہہ دیا ہے جس میں تم نہیں تھیں۔

بیوی مسکراتی رہی اور سامورائی کو دیکھتی رہی۔

رات گہری ہوئی۔ سفر کی تکان سے جسم کو آرام کی طلب ہوئی اور نیند نے آگھیرا۔

بیوی سے کہا، سونا چاہئے۔ صبح ہماری زندگی کا نیا دن ہوگا۔ پھر سے اس گھر کو سجائیں گے۔ اس در پر خوشیاں دستک دیں گی۔ دونوں خواب گاہ کی طرف گئے۔

بیوی سے پوچھا، یہ عرصہ اکیلے کس طرح گزارا؟

بیوی بولی، بس — گزر گیا۔ یوں کہو کہ مجھے اس سے گزارا گیا۔ آواز میں مایوسی اور دکھ تھا۔

سامورائی بولا، میں بہت شرمندہ ہوں۔

بیوی دکھ سے مسکراتے ہوئے بولی، مجھے چھوڑ کر اس

کے پاس گئے، اب اسے چھوڑ کر میرے پاس آئے ہو؟

الفاظ گم ہو گئے۔ ندامت سے آہستہ آواز میں اتنا کہہ سکا کہ پتہ نہیں یہ سب مجھ سے کیسے ہو گیا۔

اس طرح رات گزر گئی۔

صبح سورج کی کرنیں کھڑکی سے چھن کر کمرے میں داخل ہوئیں تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کروٹ لئے لیٹا ہوا تھا۔ پشت بیوی کی جانب تھی۔ کروٹ بدلے بغیر بیوی کو آواز دی، اٹھ جاؤ۔ لگتا ہے سورج سر پر آ گیا ہے۔

بیوی نے جواب نہیں دیا تو دوسری بار پھر پکارا اور مڑ کر دیکھا تو وجود کانپ اٹھا — ساتھ ہڈیوں کا پنجر پڑا ہوا تھا جس کے پاؤں پلنگ سے نیچے جھول رہے تھے۔

آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ چلانے لگا کہ یہ سب کیا ہے۔ میری بیوی کہاں ہے؟ گھبرا کر باہر نکلا اور مڑ کر دیکھا تو ڈھانچا وہیں پڑا ہوا تھا۔

سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔

رات کو اس نے مجھ سے باتیں کی ہیں، وہ زندہ میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ ہڈیوں کا پنجر کس کا ہے؟ کہیں مجھے ستانے کے لئے مذاق تو نہیں کر رہی مگر اتنا بھیانک مذاق — ؟ وہ ہانپ رہا تھا۔ قمیص بھیگ گئی تھی۔ ہانپتا ہوا گھر سے باہر آ کر بیٹھ گیا۔

سانسیں بحال ہوئیں تو قریبی گھروں کا جائزہ لیا۔ آس پڑوس کے گھر تبدیل ہو چکے تھے اور اس کے گھر سے فاصلہ پر تھے۔ ایک اسی کا گھر پرانی حالت میں موجود تھا۔ البتہ در و دیوار میں یاس و تنہائی کا ڈیرہ تھا۔

فاصلہ پر موجود گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا؟ آدمی باہر آیا اور پوچھا کس سے ملنا ہے؟ آپ کون ہیں؟

سامورائی نے کہا، معاف کیجئے گا میں نے آپ کو صبح صبح زحمت دی۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں سامنے والے مکان میں کون رہتا ہے؟ آدمی نے سامورائی پر گہری نگاہ ڈالی۔ اس مکان میں — ؟

جی اسی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔

آدمی بولا، میں نے آپ کو پہلے یہاں نہیں دیکھا۔ لگتا ہے کہ آپ مسافر ہیں اور کسی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔

سامورائی بولا، میں اس مکان کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ کیا یہاں کوئی نہیں رہتا؟

پڑوسی نے بتایا، سنا ہے کہ کئی برس پہلے اس مکان میں ایک سامورائی حسین و جمیل بیوی کے ساتھ کس مپرسی کی زندگی گزار رہا تھا۔ میاں بیوی میں مثالی محبت تھی۔ حالات خراب ہونے کے باجود بیوی حرف شکایت زبان پر نہیں لائی۔ پھر سامورائی نوکری کے سلسلہ میں دوسرے شہر چلا گیا اور بیوی کو یہاں اکیلا چھوڑ گیا۔ مہینے گزر گئے لیکن سامورائی کی طرف سے خیر خبر نہیں آئی۔ اس نے مڑ کر بیوی کا حال پوچھا نہ خط لکھا، پیغام بھجوایا اور نہ خرچ بھیجا۔ بیوی نے جس حال میں زندگی بسر کی، وہ تکلیف دہ ہے۔ خوددار اور وفادار عورت تھی۔ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ انتظار میں دن گن رہی تھی کہ

شوہر واپس آ جائے۔

سامورائی بولا، وہ کہاں ہے؟ جلدی بتاؤ۔

سامورائی کی بے صبری کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے پڑوسی نے بات جاری رکھی۔ ایک روز کسی نے خبر دی کہ سامورائی کا انتظار چھوڑ دے، بے وفا نے دوسری شادی کر لی ہے اور شاہانہ زندگی گزار رہا ہے۔

بیوی یہ سن کر بے حال ہوگئی۔ اعتماد کو ٹھیس پہنچی تھی۔ پہلے پہل یقین نہیں کیا لیکن گزرتے دنوں کے ساتھ جب سامورائی کی طرف سے پیغام نہیں آیا تو خبر کی صداقت پر یقین ہوگیا۔ شوہر نے محبت کی قدر نہیں کی۔ اس سوچ نے نڈھال کر دیا، ہمت جواب دے گئی اور بیمار رہنے لگی۔ کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔

پوچھا، پھر کیا ہوا—؟ پڑوسی نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بتایا—اور پھر ایک دن وہ بے چاری مر گئی۔

سامورائی کو دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ ہاتھوں کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش میں منہ سے صرف اتنی آواز نکلی، پھر کیا ہوا؟ کفن دفن کس نے کیا؟

وہ بولا، کہتے ہیں کہ وہ کئی کئی دن گھر سے نہیں نکلتی تھی۔ بستر پر لیٹی دروازہ کو دیکھتی رہتی تھی، اسی حالت میں اس کا انتقال ہوا۔ دوسرے گھر فاصلہ پر تھے، موت کی خبر دیر سے ہوئی اس لئے کوئی ڈیڈ باڈی کے قریب نہیں آیا یہاں تک کہ جسم ڈھانچا ہو گیا۔ سالوں گزر گئے۔ تم کون ہو اور کیوں پوچھ رہے ہو۔ کیا تم اس کے رشتہ دار ہو؟

داستانِ شوق

داستانِ شوق کتنی بار دہرائی گئی
سننے والوں میں توجہ کی کمی پائی گئی

فکر ہے سہمی ہوئی، جذبہ ہے مرجھایا ہوا
موج کی شورش گئی، دریا کی گہرائی گئی

حسن بھی ہے مصلحت میں، عشق بھی دنیا شناس
آپ کی شہرت گئی، یاروں کی رسوائی گئی

ہم تو کہتے تھے زمانہ ہی نہیں جوہر شناس
غور سے دیکھا تو اپنے میں کمی پائی گئی

زخم ملتے ہیں علاج زخم دل ملتا نہیں
وضع قتل رہ گئی، رسم مسیحائی گئی

میری مدھم لے کا جادو اب بھی باقی ہے سرورؔ
فصل کے نغمے گئے، موسم کی شہنائی گئی

داستان شوق کتنی بار دہرائی گئی
سننے والوں میں توجہ کی کمی پائی گئی

(کلام: آل احمد سرورؔ)

وہ جواب دیئے بغیر تھکے قدموں سے پلٹ آیا۔

لوگوں کا کہنا ہے کہ سامورائی کی بیوی شوہر سے ملنے کو بے قرار تھی کہ مرنے کے بعد بھی اسے صبر نہیں آیا۔ سامورائی واپس آیا تو بیوی کی روح گھر پر منتظر تھی۔

طاہر محمود

خیالات کی دنیا

قانون منکشف ہوتا ہے کہ شے کی مضبوطی کا تعلق فرماں برداری اور نافرمانی کے نظام سے ہے۔ دھاتیں اور دیگر عناصر چاہے کتنے مضبوط ہوں، بکھر جاتے ہیں ــــ حفاظت کرنے والی ذات اللہ ہے۔

خیالات کہاں سے آتے ہیں؟

ماحول ان سے کس طرح متاثر ہوتا ہے؟

ہم ان کو کس میکانزم کے تحت قبول کرتے ہیں؟

خیال کو ارادہ میں تبدیل کرنے کا کیا میکانزم ہے؟

خیال پر نیت کے کیا اثرات ہیں؟

کن خیالات پر عمل سے اللہ کی قربت ملتی ہے؟

ہر کوئی ان سوالات کے جواب تلاش نہیں کرتا!

خوش قسمتی سے اللہ کے دوست کا قرب میسر آجائے تو وہ آدمی کی توجہ باطنی دنیا کی طرف کر دیتے ہیں اور پھر معلوم ہوتا ہے کہ خیال ہی مکمل دنیا ہے جس میں ہم رہتے ہیں اور جس کے تابع ہو کر افعال و اعمال انجام دیتے ہیں۔ ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں،

ہر چیز خیالات کی ہے پیمائش
ہیں نام کے دنیا میں غم و آسائش
تبدیل ہوئی جو خاک گورستان میں
سب کوچہ و بازار کی تھی زیبائش

خانوادہ سلسلہ عظیمیہ، عظیمی صاحب رباعی کی تشریح بیان کرتے ہیں،

''انسانی نگاہ کے سامنے جتنے مناظر ہیں وہ شعور کی بنائی ہوئی مختلف تصویریں ہیں۔ یہ تذکرہ ہو چکا ہے کہ دیکھنے کی یہ طرز مفروضہ ہے۔ اس لئے اس کے مشاہدات و تجربات بھی مفروضہ ہیں۔ دیکھا جاتا ہے کہ ایک ہی چیز ایک آدمی کے لئے خوشی اور دوسرے کے لئے غم کا باعث ہوتی ہے۔ ایک چیز کے بارے میں مختلف لوگوں کی سینکڑوں مختلف آرا ہوتی ہیں حالاں کہ حقیقت ایک اور صرف ایک ہو سکتی ہے۔ عام مشاہدہ ہے کہ ہماری نگاہ کے سامنے مظاہر میں ہر وقت تغیر ہوتا رہتا ہے۔ آبادی ویرانہ میں اور ویرانہ آبادی میں بدل جاتا ہے۔ یہ متغیر دنیا کس طرح حقیقی ہے ــــ حقیقت میں تغیر نہیں ہوتا۔''

قرآن کریم میں ارشاد ہے،

''تم اللہ کی سنت میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے اور تم کبھی نہ دیکھو گے کہ اللہ کی سنت کو اس کے مقررہ راستہ سے کوئی طاقت پھیر سکتی ہے۔'' (فاطر:۴۳)

قطع نظر اس کے کہ اطلاع کے مدارج پر بات کی

جائے جن کو واہمہ، خیال،تصور،احساس اورمظاہرہ کہا جاتا ہے،ہم قارئین کی آسانی کے لئے لفظ ''خیال'' پر اکتفا کر لیتے ہیں۔یونی ورسٹی میں علوم کے مختلف شعبے ہیں۔اسلامیات کا شعبہ الگ ہے۔معاشیات،ریاضی، طبیعیات،ارضیات اور جغرافیہ کے شعبے الگ ہیں۔اسی طرح خیال بھی مختلف شعبوں پر مشتمل ہے۔ان کی قبولیت کا تعلق ذہن کی وسعت نظری اور تنگ نظری کے ساتھ ہمارے چاہنے اور نہ چاہنے پر ہے۔

مثلاً میں چاہتا ہوں کہ چائے بنائی جائے۔حافظہ میں چائے بنانے کا طریقہ خیال کے ذریعے دماغ کی اسکرین پر آجاتا ہے کہ کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے لئے کتنی مقدار میں دودھ، پتّی،چینی اور پانی ڈالنا ہے۔آنچ تیز رکھنی ہے یا ہلکی، پانی کے گرم ہونے کے کتنی دیر بعد پتّی اور چینی ڈالنی ہے اور پتّی پکنے کے بعد دودھ کب شامل کیا جائے۔

ہر وہ کام جو معاشرہ سے سیکھا ہے،میرے حافظہ میں ریکارڈ ہے اور میں اسی کے مطابق عمل کرتا ہوں۔ جو شے حافظہ میں ہے، فی الواقع وہی میرا شعور ہے اور جو شے حافظہ میں نہیں، وہ میرا لاشعور ہے۔

یاد کرنے کی کوشش پر بات یاد نہ آئے تو ہم کہتے ہیں کہ بھول کے خانہ میں چلی گئی۔بھول کا خانہ کیا ہے؟

خیالات کی ذمہ داری اطلاع کو لانے اور لے جانے کی ہے۔

ذہن میں جو ماحول قائم ہے،اس کے مطابق ہم خیال میں معنی پہناتے ہیں۔گھر میں پریشانی ہے تو آفس میں مصروفیت کے باوجود ذہن پریشان ہوتا ہے اور بعض اوقات ہم صحیح باتوں کا غلط مطلب سمجھ لیتے ہیں۔خیال کی ہم نے جس طرح پیمائش کی،آنکھ نے اس کو ذہن کے مطابق دیکھا۔خیال اپنی اصل میں مقدار پر قائم ہے۔اگر کسی خیال میں ریگستان کی تصویر ہے تو ریگستان کی تصویر بنتی ہے۔

بنیادی تقاضوں سے متعلق خیالات آدمی اور جانور دونوں میں مشترک ہیں۔ہم زمین پر حاکم ہوتے ہوئے بھی محکوم ہیں اس لئے بھوک پیاس اور اغراض کے ہاتھوں مجبور ہیں۔

یہ بات قابل غور ہے کہ جانور اور آدمی کو آنے والے خیالات یکساں ہیں چاہے ان تقاضوں کا تعلق جبلت سے ہو یا فطرت سے۔غور کرنے پر عقدہ کھلتا ہے کہ مخلوق کی سطح پر سب ایک ہیں۔آدمی نے اچھا گھر تعمیر کر لیا تو کیا ہوا—بیا،شہد کی مکھی،مکڑی اور بعض دوسری مخلوقات کے فنِ تعمیر کو دیکھ کر آپ سر اہے بنا نہیں رہیں گے کہ یہ انجینیئرنگ کے شاہ کار ہیں۔بیا پرندہ جن خیالات کی راہ نمائی میں گھر بناتا ہے وہ آندھی اور طوفان میں بھی قائم رہتا ہے جب کہ آدمی کے بنائے ہوئے بہترین گھروں کی چھتیں اڑ جاتی ہیں۔بیا اور آدمی دونوں کو گھر بنانے کا خیال آتا ہے۔آدمی خیال میں معنی پہناتا ہے،بیا معنی نہیں پہناتا اس لئے تنکوں

سے بننے والا اس کا گھر مضبوط اور آدمی کا گھر کنکریٹ، ریت اور سریوں سے بن کر بھی کم زور ہوسکتا ہے۔

قانون منکشف ہوتا ہے کہ شے کی مضبوطی کا تعلق فرماں برداری اور نافرمانی کے نظام سے ہے۔ دھاتیں اور دیگر عناصر چاہے کتنے مضبوط ہوں بکھر جاتے ہیں، حفاظت کرنے والی ذات اللہ ہے۔

محدود ذہن لامحدود خیال کو محدود دیکھتا ہے۔ وجہ وہ چھلنی ہے جس میں ہم ذہنی رجحان اور دل چسپی کے مطابق خیالات کو چھانتے ہیں۔

مثلاً مجھے خیال آیا کہ میں گھر کے سامنے چھوٹے نالے پر محلّہ والوں کی مدد سے عارضی پل بنالوں تاکہ گاڑی گزرنے میں آسانی ہو۔ پھر سوچا کہ نالا میرے گھر کے سامنے ہے لہٰذا پل کا سائز اتنا ہو کہ میری گاڑی آرام سے گزر جائے۔ پل اپنے وقت پر بن جائے گا اور اس پر سے بے شمار گاڑیاں گزریں گی لیکن اپنے فائدہ کو اہمیت دے کر ذہن کو محدود کردیا۔

ہم خیال کو جتنا محدود کرتے ہیں، وسائل بھی اسی مناسبت سے محدود ہو جاتے ہیں کیوں کہ خیالات کی گاڑی میں ہی وسائل لوڈ ہو کر آتے ہیں۔

غلطی کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے کہ ہم مخصوص طرز فکر کے تحت چیزوں کا ایک دوسرے سے موازنہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے اصل خیال پس پردہ چلا جاتا ہے اور اس کی جگہ ہمارا ذہن لے لیتا ہے۔

مثال: تعلیمی میدان میں شعبہ کے انتخاب کا وقت آیا تو رجحان کی مناسبت سے پہلا خیال ہوٹل مینجمنٹ کا آیا۔ اردگرد ماحول کو دیکھا تو لوگوں نے کہا کہ کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کی جائے کیوں کہ کمپیوٹر کا دور ہے۔ فلاں دوست کو سافٹ ویئر کمپنی میں اچھے عہدہ پر ملازمت مل گئی اور کئی رشتے دار ہیں جو کمپیوٹر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے مختلف کمپنیوں میں اچھے عہدوں پر فائز ہیں لہٰذا ہوٹل مینجمنٹ کا خیال درست نہیں۔

میں نے رجحان کے برعکس داخلہ لے لیا۔ نتیجہ میں توجہ متاثر ہوئی اور کمپیوٹر کے شعبہ میں اعلیٰ کارکردگی نہ دکھا سکا۔ جب تعلیم کے بجائے میرا مقصد روزگار بن گیا تو نمبر بھی کم آئے۔ اگر میں نے پہلے خیال پر عمل کیا ہوتا تو ہوٹل مینجمنٹ کی تعلیم میں یک سوئی ہوتی اور نتیجہ قابل قدر نکلتا۔

ارادہ میں تبدیلی کیسے آئی—؟

خیال نے راہ نمائی کی کہ فلاں شعبہ میں داخلہ لو۔ جب تعلیم کو کاروبار کے تناظر میں دیکھا تو پہلے خیال کو رد کردیا۔ خیال میں ٹوٹ پھوٹ ہوئی اور پہلے خیال میں موجود وسائل تبدیل ہوگئے۔ چوں کہ ارادہ کر کے ارادہ تبدیل کرنے کی عادت ہے اس لئے ذہن کمپیوٹر سائنس میں بھی نہیں رکا— ڈگری مل گئی مگر قابلیت نمایاں نہیں ہوئی۔

ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں،

''ارادہ دراصل شکل وصورت رکھتا ہے۔جس مطلب کا ارادہ ہو،مطلب اپنی پوری شکل وصورت کے ساتھ ارادہ میں مرکوز ہونا ضروری ہے۔بغیر شکل و صورت کے کسی ارادہ کو ارادہ نہیں کہتے۔''

ارادہ کی تکمیل کے وسائل ارادہ کے ساتھ موجود ہوتے ہیں اور نیت کے ساتھ وسائل متحرک ہوجاتے ہیں۔ارادہ بدل دیں،پہلی تحریک رک جائے گی۔اب دوسرے ارادہ کے تحت وسائل متحرک ہوں گے۔ عمل کو تکمیل سے پہلے بدل دیا جائے تو کوئی کام مکمل نہیں ہوتا۔ وسائل کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں اور لہروں یا برقی تاروں کے ذریعے ذہن سے منسلک ہیں۔آدمی مطالعہ کا شوقین ہے اورادب سے استفادہ کرنا چاہتا ہے تو قانون قدرت کے مطابق دنیا میں جتنی لائبریریاں ہیں اور جہاں بھی کتابیں موجود ہیں، سب باطنی طور پر متحرک ہوجاتی ہیں اور برقی لہروں کے ذریعے راغب کرتی ہیں۔عزت ، دولت ،شہرت، محبت ،نفرت ،حسد سب فرد کے نیت کرتے ہی جہاں پر ہیں،متحرک ہوجاتے ہیں اوراُس ذہن سے رجوع کرتے ہیں جو اِن میں کشش محسوس کرتا ہے۔

ہم خیال کو جس طرح قبول کرتے ہیں اسی کے مطابق وسائل ربط میں آتے ہیں۔وسائل مخلوق ہیں اوران کی ذمہ داری دوسری مخلوقات کو ارادہ کی تکمیل میں مدد کرنا ہے۔اس لئے خیال کو اصل رخ میں قبول کرنے کی کوشش کریں۔

فرد پریشان ہے اور تنگ آکر دریا میں چھلانگ لگانا چاہتا ہے۔یہ خیال کے برخلاف عمل ہے کیوں کہ خیال جس مقام سے آتا ہے وہاں خیر اور بھلائی ہے۔پریشان ذہن کو خیال مسخ کرنے کی عادت ہے اسی لئے وہ پریشان ہے اور خود کو ختم کرنے کی نہج پر پہنچ گیا ہے۔

خیال کو خالص قبول کرنے کا راستہ ضمیر کی آواز پر عمل ہے۔ضمیر قدرت کی ودیعت کردہ چھلنی ہے جو صحیح اور غلط کو الگ کرتی ہے اور فوراً مطلع کردیتی ہے۔ ضمیر کی چھاؤں میں خیال کو قبول کرنے سے شک دور ہوتا ہے اور ارادہ میں اتنی قوت پیدا ہوجاتی ہے جتنی ''سوا لاکھ بار'' ارادہ کو دہرانے سے بنتی ہے۔ ارادہ ضمیر کے برخلاف ہو تو سوا لاکھ بار دہرانے سے بھی فائدہ نہیں ہوتا۔ضمیر کی آواز کو صحیح طور پر قبول کرنے کے لئے توجہ اور یک سوئی درکار ہے اور یک سوئی کی بہترین مشق ''مراقبہ'' ہے۔

درپیش مسائل کی وجہ خیال کو نظر انداز کرکے خواہش کے مطابق معنی پہنانا ہے۔خیال جس مقام سے آتا ہے وہ ایک ہے ـــ معنی پہنانے والے ذہن کثرت میں ہیں۔یہی وجہ ہے کہ خواہشات میں تصادم ہے اور تصادم نے بے سکونی پھیلادی ہے۔خالص خیال کو قبول کیا جائے تو ہم سکون سے واقف ہوجائیں گے۔

شاہد احمد

67 کروڑ.....؟

غشاوہ عربی میں ایسی دھند کو کہتے ہیں جو اپنے پیچھے موجود منظر کو غیر موجود ظاہر کرے۔ غشاوہ کی حالت میں وہ خلیے جو لاشعور سے اطلاعات وصول کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں، مردہ ہو جاتے ہیں۔

وجود میں موجود تقاضے متوجہ کرتے ہیں کہ متعلقہ وسائل کی ضرورت ہے۔ بھوک، پیاس، میل ملاپ سب تقاضے ہیں جن کے حصول کے لئے آدمی ساری زندگی شعوری طور پر کوشاں رہتا ہے۔ خلا کی تسخیر، فلک بوس عمارتیں، جدید تحقیقی آلات اور گھریلو استعمال کی اشیا بلاشبہ ترقی کا ثبوت ہیں لیکن مادی شعور ترقی کے باوجود عدم تحفظ کا شکار ہے اور آرام و آسائش کے حصول کے لئے خوف اور اندیشوں کی تحریک پیدا کر کے مستقبل کو محفوظ کرنے کی تکرار کرتا ہے۔

عدم تحفظ کی وجہ یہ ہے کہ وہ جس نظر سے خود کو اور دنیا کو دیکھ رہا ہے، اس نظر میں تغیر ہے۔ جب دنیا اسے بدلتی ہوئی نظر آتی ہے تو وہ اس عمل کو اپنی نظر کے بجائے دنیا پر گمان کرتا ہے۔ جب آدمی چیزوں کو بدلتا ہوا دیکھتا ہے تو خوف پیدا ہوتا ہے کہ چیزوں کی طرح حالات بھی بدلیں گے لہٰذا وہ ہر وقت خود کو محفوظ کرنے کی کوشش میں رہتا ہے۔

غور کریں ــــ شعور ایسا وجود ہے جسے زندہ رہنے کے لئے وسائل فرد کی مرضی و منشا کے بغیر مہیا ہوتے ہیں۔ مثلاً نظام تنفس کے تحت سانس لینے کے عمل پر توجہ کی جائے تو عام آدمی روزانہ ایک منٹ میں 16 دفعہ، ایک گھنٹے میں 960 اور ایک دن میں 23 ہزار 40 مرتبہ سانس لیتا ہے۔ اگر عمر 80 سال ہے تو اس حساب سے فرد اپنی پوری عمر میں اوسطاً سڑسٹھ کروڑ ستائیس لاکھ اڑسٹھ ہزار (672,768,000) سانس لیتا ہے۔

سانس لینا ارادی عمل نہیں ہے۔ ارادہ سے سانس لینے کا تجربہ کریں تو ہم بمشکل 24 سانسیں لینے کے بعد تھک جائیں گے۔ نظام ہضم سے لے کر جگر، گردوں اور پھیپھڑوں کا نظام ہماری کوشش کے بغیر جاری ہے۔ جسمانی مشینری اپنے افعال ہرگز شعور کے تحت انجام نہیں دیتی۔ پابندی کا یہ عالم ہے کہ ہمارے پاس جسم کو تحریک دینے والی ایجنسی کو نام دینے کے لئے بھی الفاظ نہیں اس لئے ہم اسے لاشعور کہتے ہیں۔ لاشعور کا مطلب ہے کوئی شعور نہیں۔

عربی میں شے کی نفی کے لئے لفظ لا استعمال ہوتا

ہے۔شعور کی نفی کے تحت صادر ہونے والے اعمال کو لاشعور کا نام دیا گیا۔ لامحدود اور لاشعور میں مشترک عنصر یہ ہے کہ محدود اور شعور کی جس وسعت سے ہم واقف نہیں، لامحدود اور لاشعور کہہ دیتے ہیں۔

قارئین! اس نقطہ پر غور کیجئے۔

ایک امریکی ماہر حیاتیات کے مطابق ہمارا لاشعور خود کار سپر کمپیوٹر کی طرح کام کرتا ہے۔ یہ ایک سیکنڈ میں 40 ملین Bits کی حد تک معلومات پروسیس کرتا ہے اور ہمارے 95 فی صد معاملات کو کنٹرول کرتا ہے۔

یہ اعداد و شمار مادی ذہن کی تحقیق کا نتیجہ ہیں اس لئے حتمی نہیں، کیوں کہ پوری زندگی لاشعور کے تابع ہے۔ سمجھنے کے لئے اگر ہم اس تحقیق کے مطابق بات آگے بڑھائیں تو یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ مادی تحقیق اس نتیجہ پر پہنچ چکی ہے کہ ہماری 95 فی صد زندگی شعوری کوشش اور اختیار و ارادہ کے بغیر گزر رہی ہے جب کہ ایسا نہیں ہے۔

الہامی کتابیں راہ نمائی کرتی ہیں کہ شعور کو اپنی تمام تر کارکردگی کے لئے اطلاعات لاشعور سے ملتی ہیں۔

مخلوقات مظاہر کو کیسے دیکھتی ہیں، اس کی اطلاع لاشعور شعور کو فراہم کرتا ہے۔ مثلاً ہر نوع گلاب کو گلاب اس لئے دیکھتی ہے کہ شعور کو گلاب کی اطلاع دینے والی ایجنسی لاشعور کا سورس آف انفارمیشن ایک ہے۔

ہم لاشعور کی راہ نمائی میں شے سے متعلق اطلاعات وصول کرتے ہیں اور ایجادات کرتے ہیں۔ اللہ نور السمٰوٰت والارض کے تحت کائنات کا ہر مظہر اپنے ہونے کا احساس اور دیگر مظاہر کا ریکارڈ رکھتا ہے اور یہ معلومات ایک دوسرے کو منتقل کرتا ہے — مخلوق ان معلومات کو ذہنی سکت کے مطابق قبول کرتی ہے۔ مثلاً گلاب اپنی معلومات زمین پر موجود تمام مخلوقات کو یکساں طور پر فراہم کرتا ہے۔ جواب میں کوئی گلاب کو گلابی دیکھتا ہے جب کہ بعض مخلوقات کو گلاب دیگر رنگوں میں نظر آتا ہے۔

گلاب کی پتیوں پر الٹراوائلٹ پرت ہوتی ہے جو محدود شعور سے نظر نہیں آتی۔ آدمی کا شعور الٹرا وائلٹ شعاعوں کو نہیں دیکھتا اور اپنے دیکھنے کو گلابی رنگ کہتا ہے۔ نکتہ یہ ہے کہ لاشعور میں موجود گلاب محدود شعور سے نظر آنے والے گلاب سے مختلف ہے۔ آدمی اور دیگر مخلوقات کو ایک ہی اطلاع فراہم کی گئی۔ حشرات کی نگاہ الٹرا وائلٹ رنگوں پر چلی جاتی ہے جب کہ آدمی سکت و استعداد کے تحت گلاب کو نہیں، محدود شعور کے دیکھنے کو دیکھتا ہے۔ ہم 95 فی صد اطلاعات کو نظر انداز کر کے پانچ فی صد محدود شعور کو اہمیت دیتے ہیں۔

جسمانی تقاضوں پر غور کریں تو ایک طرز یہ ہے کہ آدمی کو بھوک لگی اور اس نے کھانا کھایا۔ جب کہ دوسرا انداز فکر بتاتا ہے کہ آدم نے معدہ اور آنتوں میں

ارتعاش اور ارتعاش میں ہیجان محسوس کیا۔ لاشعور نے ذہن کو انسپائر کیا کہ ہیجان کو سکون غذا سے میسر آئے گا جسے ہم بھوک کہتے ہیں۔ یہ بھی بتایا کہ بھوک کی تسکین کے لئے وسائل موجود ہیں۔ فرد نے دستیاب شے کھا کر تقاضے کی تسکین کی۔ شعور نے ذہن پر نقوش درج کر لئے کہ مادی وجود کھائے پیئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا لہٰذا کھانے پینے کو اہمیت حاصل ہوگئی۔ شعور اس اطلاع کی مستقل تکرار جاری رکھتا ہے کہ بھوک دور کرنے کے لئے کھانا کھانا ضروری ہے۔

مشاہدہ ہے کہ کھانا وقت پر نہ ملے تو ہم کہتے ہیں کہ بھوک مرگئی۔ مگر عجیب بات ہے کہ معدہ کو غذا نہیں پہنچی اور طبیعت پھر بھی مطمئن ہے۔ کچھ لوگ کئی کئی دن بغیر غذا کے زندگی گزارتے ہیں۔ وجہ یہ نہیں کہ مادی وجود کھائے پیئے بغیر زندہ رہ سکتا ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ اس دوران جسم میں پہلے سے ذخیرہ شدہ توانائی ان کی غذا بنتی ہے۔ بظاہر وہ کچھ نہیں کھا رہے لیکن بباطن ایسا نہیں ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات احتیاج سے پاک ہے۔ اللہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے — اسے نیند آتی ہے اور نہ اونگھ!

شعور تکرار کے ذریعے ذہن میں خوف اور غم پیدا کرتا ہے۔ جب ہم رحم مادر میں تھے تو شعوری کوشش کے بغیر بھی ہمیں غذا فراہم ہو رہی تھی۔ پیدائش کے ابتدائی چند سالوں میں ہم نے بے نیازی کے ساتھ زندگی گزاری۔ لیکن جیسے ہی شعور کی حد کو پہنچتے ہیں تو بے نیازی فکرمندی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

شعور ایک وجود رکھتا ہے اور خود کو نمایاں کرنے کے لئے بار بار تکرار کرتا ہے۔ شعور میں وسعت بھی ہے اور محدودیت بھی۔ انحصار طرز زندگی پر ہے۔

آدمی ہو یا انسان — دونوں شعور کے تحت زندگی گزارتے ہیں۔ انسان کا شعور ہو بہو لاشعور کا عکس ہے جب کہ آدمی نے اپنے شعور پر محدودیت کی مہر لگا دی ہے۔ مثال کے طور پر ایک کام کا نتیجہ حق میں اور دوسرے کا مرضی کے مطابق نہیں آیا۔ اب آدمی پہلے نتیجہ کو بھول کر مایوس ہوتا ہے کہ دوسرا کام کیوں نہیں ہوا؟ چند ہفتے، مہینے یا پھر سال آزردگی میں گزر جاتے ہیں۔ اس عرصہ میں اس فرد پر ناامیدی کی اسپیس غالب رہتی ہے۔ پھر ایک روز جس شے کی خواہش تھی اس کے نقائص سامنے آتے ہیں اور فرد کہتا ہے کہ شکر ہے کہ جو میں چاہ رہا تھا وہ ہوا نہیں، میں بچ گیا۔

محدود شعور یہ نہیں سوچتا کہ جو کام نہیں ہو رہا اس کے پیچھے کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔ اس طرح اپنے معنی پہنانے اور اپنی مرضی کو اولیت دینے سے محدودیت کی مہر لگ جاتی ہے۔ محدود ذہن لاشعور کے راستہ میں مزاحم ہو کر خود کو نقصان پہنچاتا ہے اور یہ مزاحمت لاشعور اور شعور کے درمیان پردہ بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس پردہ کو ''غشاوہ'' فرمایا ہے۔

غشاوہ عربی میں ایسی دھند کو کہتے ہیں جو اپنے پیچھے موجود منظر کو غیر موجود ظاہر کرے۔ غشاوہ کی حالت میں

وہ خلیے جو لاشعور سے اطلاعات وصول کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں، مردہ ہوجاتے ہیں۔ ارشاد باری ہے،

''اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے۔'' (البقرۃ:۷)

ان پردوں کے باعث حقیقت ہمارے لئے غیب بن جاتی ہے۔

کہتے ہیں کہ ہم 10 کلومیٹر سے دور نہیں دیکھ سکتے لیکن سورج جو کروڑوں میل دور ہے اسے دیکھ رہے ہیں۔ بغیر کسی تحقیق کے اس استدلال کو مان لیتے ہیں کہ سورج چوں کہ حجم (سائز) میں بڑا ہے، اس لئے ہم دیکھ لیتے ہیں۔ کیا ہم سورج کو ویسے ہی دیکھ رہے ہیں جیسے وہ ہے —؟ مادی علوم سورج کو سرخ گولا سمجھتے ہیں جب کہ روحانی ماہرین کا کہنا ہے کہ سورج توے کی مانند سیاہ ہے۔

رنگ دیکھنے کا قانون یہ ہے کہ جب درخت پر لگے ہوئے سیب پر سورج کے ذریعے آنے والی روشنی پڑتی ہے تو سورج منشوری نظام کے تحت سیب کو تمام رنگ کی روشنیاں فراہم کرتا ہے۔ سیب اپنی عمر کی مناسبت سے رنگوں کو ظاہر کرتا ہے۔ پہلے ہرا پھر پیلا پھر سرخ اور آخر میں گہرا چاکلیٹی رنگ ہوجاتا ہے۔

محدود شعور بھی مخلوق ہے۔ اس وجود کو اختیار کرنے سے فرد اس کی صفات کے مطابق چیزوں کو دیکھتا ہے۔ محدود شعور جو رنگ ہمیں دکھانا چاہتا ہے، اس شے کے اندر موجود دیگر رنگوں کو مغلوب کر دیتا ہے یا اطراف میں اس کے متضاد رنگ غالب کر دیتا ہے۔

فرض کریں اگر ہمیں سیاہ یا سرخ رنگ کا باکس تیار کرنا ہو تو ہمارے پاس باکس کو سیاہ یا سرخ دکھانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم باکس کے اطراف کو سفید رنگ سے روشن کر دیں۔ اس سے باکس پر سیاہ رنگ یا کوئی بھی رنگ نمایاں ہوجائے گا۔

شعور زندگی کے مراحل کس طرح طے کرتا ہے اور اگر یہ محدود ہوجائے تو کیا نتیجہ سامنے آتا ہے، اس حوالہ سے تحریر پڑھئے۔

''شعور میں داخل ہونے سے پہلے کوئی انسان باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا سے واقف نہیں ہوتا۔ شعوری دبستان میں قدم رکھتے ہی انسان کے اندر نیا جوش اور نئے ولولے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اندر تخلیقی صلاحیتوں کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے۔ اور یہ تخلیقی صلاحیتیں اسے بالآخر ایسے نقطہ پر لے آتی ہیں جس نقطہ کا آغاز ہی نئی نئی تخلیقات سے ہوتا ہے۔ کوئی بندہ جب اس نقطہ میں داخل ہوتا ہے تو اس کے اندر باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا کے سوتے پھوٹنے لگتے ہیں۔ نتیجہ میں بالکل اپنے جیسی جیتی جاگتی تصویر بنا لیتا ہے۔ یہ تصویر بھی انسانی مشین کا کل پرزہ ہے اور اس پرزے کی فیڈنگ کے لئے ایک آٹو میٹک نظام جاری وساری ہے۔ آدم زاد اس تصویر کو زندہ اور متحرک رکھنے کے لئے وسائل تلاش کرتا ہے اور

وسائل کی تلاش میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ اس سے خود آگاہی منحرف ہو جاتی ہے۔تصویر کو اللہ تعالیٰ نے اولاد اور وسائل کو اموال کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق مال اور اولاد انسان کے لئے فتنہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مال اور اولاد کو فتنہ فرمایا ہے۔ اور بندہ اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ، اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ، اپنی پوری دانائی کے ساتھ اس فتنہ سے قریب ہو رہا ہے۔اللہ تعالیٰ نے مال اور اولاد کو فتنہ کیوں کہا؟ یاد رکھئے! ہر وہ چیز جو عارضی ہے، حقیقت نہیں ہوتی اور جو چیز حقیقی نہیں وہ حق سے قربت حاصل نہیں کر سکتی۔ مال ہو یا اولاد یہ سب عارضی اور غیر حقیقی تصویریں ہیں۔ بندہ جب ان عارضی اور غیر حقیقی تصویروں کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتا ہے تو یہ سب اس کے لئے مصیبت اور فتنہ بن جاتی ہیں۔'' (کتاب: آواز دوست)

محدود زندگی میں جتنا لا محدودیت کا تذکرہ ہوگا، ذہن میں وسعت پیدا ہوتی جائے گی۔ جب بچہ اسکول نہیں جاتا تو اس کے الفاظ کا ذخیرہ اسکول جانے والے بچے سے کم ہوتا ہے۔ بات ماحول کی ہے۔ مادی شعور میں رہنے والے کا ذہن محدود اور مادیت سے ماورا زندگی سے واقف ہونے والے ماحول میں شعور بھی مادیت سے ماورا ہوتا ہے۔غور طلب ہے کہ وہ کون سی شے ہے جو اس دوران ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ میں داخل ہو رہی ہے—؟ وہ شعور ہے۔

باتیں وہ جن میں دانائی ہو

بادشاہ نے سفر کے دوران ایک باغ میں بوڑھے شخص کو پودوں اور درختوں کی صفائی کرتے دیکھا تو آواز دی اور پوچھا، کیا تجھے ان درختوں کا پھل کھانے کی امید ہے؟

بوڑھے نے جواب دیا، ہم سے پہلے لوگوں نے زراعت کی، ان کا پھل ہم کھا رہے ہیں۔اب میں اپنے بعد آنے والوں کے لئے محنت کر رہا ہوں۔

بادشاہ نے جواب سے خوش ہو کر انعام میں ہزار اشرفیاں دیں۔بوڑھا ہنس پڑا۔

بادشاہ نے پوچھا، ہنسنے کی کیا بات ہے؟

کہا، بادشاہ سلامت! درختوں کے اس قدر جلد پھل دینے سے تعجب ہوا۔ بادشاہ نے ذہانت سے متاثر ہو کر مزید ہزار اشرفیاں دیں۔

بوڑھا پھر ہنس دیا۔

بادشاہ نے پوچھا، اب ہنسنے کی وجہ کیا ہے؟

وہ بولا، جناب عالی! کاشت کار سال گزرنے کے بعد ایک دفعہ فائدہ اٹھاتا ہے ۔ مجھے محنت نے تھوڑی دیر میں دوبار فائدہ پہنچایا ہے۔

بادشاہ ہنس دیا۔ شاباشی دیتے ہوئے مزید ہزار اشرفیاں دیں اور آگے بڑھ گیا۔

سبق یہ ہے کہ محنت کے ساتھ دانائی کی بات آدمی کو ہمیشہ فائدہ پہنچاتی ہے۔

اقتباسات

’’ماہنامہ قلندر شعور‘‘ کو گلدستہ بنانے کے لئے قارئین کی کوششیں قابل قدر ہیں۔ قرآن کریم، آسمانی کتابوں، ملفوظات، تاریخ، انکشافات اور سائنسی فارمولے بھیج کر اس رسالہ کا حصہ بن سکتے ہیں۔ تحریر کم وبیش 120 الفاظ پر مشتمل ہو۔

مرشد باطن پر توجہ کرتا ہے اور شاگرد کو تعلیم و تلقین میں اشکال و حروف کے بجائے معنویت میں محو کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ چوں کہ تم تغیر سے واقف ہو اس لئے ظاہر پر اکتفا مت کرو، باطن کا علم حاصل کرو۔ مرشد اپنی نگاہ سے مرید کے باطن میں تزکیہ کی شمع جلاتا ہے اور کہتا ہے اب اندر سے پڑھ — لا الٰہ الا اللہ۔ جب دل کلمہ پڑھتا ہے تو فکشن نظر کا لینس ٹوٹ جاتا ہے، پردے ہٹتے ہیں اور بندہ کو الحی القیوم اللہ تعالیٰ کی صناعی کے رموز نظر آتے ہیں۔

(مرسلہ: وجاہت محسن۔ راولاکوٹ)

ترقی کا پھل فوراً نہیں ملتا۔ ترقی کی چال سست ہے۔ اوپر پہنچنے میں ہمیشہ وقت لگتا ہے بنسبت نیچے اترنے کے۔ ترقی آج جس مقام پر ہے، یہ صرف موجودہ دور کی کاوش نہیں۔ ہر دور کی کوشش اور جدوجہد ہے۔ نسل آدم نے کئی زمانوں کا سفر طے کیا ہے۔ یہ بھی سمجھنا غلط ہے کہ یہ مسافت پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہے۔ یہ جاری و ساری عمل ہے۔ نہ ابتدا سے کوئی واقف ہے نہ انتہا کا علم ہے۔ ترقی کی چمک دمک نے آدمی کو بے حس کر دیا ہے اور اس کے احساسات بے معنی ہو گئے ہیں۔

(مرسلہ: سائرہ شاہ، کتاب: فکری مکالمات)

ہر شے کی زیادتی مضر ہے اور اس سے مزاج میں بھی اکتاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک ہی شے ہو تو انہماک پیدا نہیں ہوتا۔ مثلاً روزانہ حلوہ یا پلاؤ کھانے سے آدمی کا دل بھر جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آدمی میں تغیر ہے۔ ہر بار نئی چیز چاہئے۔ جب کہ غور کریں تو سارے کھانے کم و بیش ایک طرح کے اجزا سے بنتے ہیں، مقداروں کے فرق سے ذائقہ بدل جاتا ہے اور آدمی اس کو نیا کھانا کہتا ہے۔

(مرسلہ: ثریا بی بی، لاہور)

محمد بن موسیٰ خوارزمی انسائیکلوپیڈیا کے اصول کا موجد ہے۔اس سے پہلے بعض حکما نے عام معلومات پر اچھی کتابیں مرتب کی تھیں۔مگر ان کی ترتیب علوم کے لحاظ سے کی گئی تھی، ابجد کے قاعدہ سے نہیں۔خوارزمی نے ''مفاتیح العلوم'' کے نام سے ضخیم کتاب لکھی۔ اس نے علوم سائنس سے متعلق خاص خاص مضامین مثلاً ریاضی، ہیئت، طبیعیات، کیمیا، طب، موسیقی پر عمدہ اور مکمل مضامین لکھے اور فنون کو اب ج یعنی ابجد کے اصول پر تقسیم کر کے اسی لحاظ سے مرتب کیا۔ مفاتح العلوم کو لندن میں ایک علمی ادارہ نے اہتمام سے شائع کیا۔ (مرسلہ: محمد علی، کتاب: 100 عظیم مسلم سائنس دان)

وقت آپ کا بہترین اثاثہ ہے۔آپ اپنے وقت سے پہچانے جاتے ہیں۔زندگی وقت سے شروع ہوتی ہے اور ہر کام وقت کے صرف سے ہوتا ہے۔ وقت کو اہم ضروریات کے لئے استعمال کریں۔کام ہاتھ سے ہو یا دماغ سے، وقت کو کارآمد بنائیں۔ایک دن میں مخصوص گھنٹے اور ایک مہینہ میں مخصوص دن ہوتے ہیں۔ اس مناسبت سے اپنے وقت کو تقسیم کریں۔ بزرگ کہتے ہیں کہ بلاضرورت کچھ نہ کرو۔ضرورت اپنی بھی ہوسکتی ہے اور دوسروں کی بھی۔ وقت کا بہترین استعمال وہ لوگ کرتے ہیں جو مقصد کے تحت زندگی گزارتے ہیں ورنہ مصروف تو گائے بھی رہتی ہے۔

دیکھئے ہر وقت جگالی کرتی ہے اور جگالی کا نتیجہ جھاگ ہے۔آدمی جگالی کے لئے پیدا نہیں ہوا۔لہٰذا اس بات کو سمجھیں کہ جو لمحات ہمیں میسر ہیں یہ کسی نے دیئے ہیں، اس لئے کہیں سے آتے ہیں اور ہم سے گزر کر لوٹ جاتے ہیں۔ وقت امانت ہے، کس کی طرف سے اور کیسی امانت — یہ جاننا ہمارا کام ہے۔

(مرسلہ: واسع شکور، کراچی)

تحریر قاری کے اوپر ایک تاثر چھوڑ دیتی ہے۔ایسا تاثر جو ذہن کے اندر فکر و فہم کی تخم ریزی کرتا ہے اور پھر یہی فکر و فہم ایک تناور درخت بن جاتی ہے۔ اپنی تحریر اور تقریر میں ہمیشہ اعتدال کا راستہ اختیار کیجئے۔ الفاظ کی نشست و برخاست ایسی ہو کہ سننے اور پڑھنے والے کے اوپر امید اور تعلق خاطر کی کیفیت طاری ہو جائے۔خوف کو درمیان میں نہ لائیے کہ خوف پر مبالغہ آمیز زور دینے سے بندہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جاتا ہے اور اسے اپنی اصلاح اور نجات نہ صرف مشکل بلکہ محال نظر آنے لگتی ہے۔تحریر میں ایسے الفاظ لکھئے جن میں رجائیت ہو۔اللہ سے محبت کرنے کا ایسا تصور پیش کیجئے کہ خوف کی جگہ ادب و احترام ہو تاکہ پڑھنے والا اللہ کی رحمت اور بخشش کو اس کے پورے ادب اور احترام کے ساتھ قبول کرے۔

(مرسلہ: یسرا خالد، کتاب: تجلیات، ملتان)

محمد عدنان خان

پورب کے ہم زاد

رنگ وچمن، عروج وزوال، عشق وسرمستی اور فنا وبقا کے رنگوں سے معمور صدیوں پر محیط داستان جس کی مکانیت تبت کی فلک بوس چٹانوں سے لے کر ٹیکسلا کی سرسبز وادیوں تک پھیلی ہوئی ہے۔

ردا کا تعلق عرب نژاد پاکستانی خاندان سے تھا۔ پاکستان میں کچھ عرصہ قیام کے دوران اپنی دوست نیلم کے گھر ذکر وفکر کی محفل میں ردا کی بزرگ سے ملاقات ہوئی جن کی توجہ نے طبیعت میں روحانیت کی طرف میلان پیدا کر دیا۔ ردا کی بہن کی شادی پاکستان میں ہوئی۔ والد کے برطانیہ تبادلہ کی وجہ سے ردا اور نیلم کے درمیان رابطہ منقطع ہوگیا۔ ردا نے برطانیہ کی ایک یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ یہاں کاربن ڈیٹنگ کے پروفیسر جی آر چوہان کے لئے ردا کی شخصیت معمہ تھی جسے جاننے میں وہ ناکام رہے۔ یونی ورسٹی کی تعلیم کے بعد جب پی ایچ ڈی آخری مراحل میں تھی تو ردا کے والد کا پھر پاکستان تبادلہ ہوگیا۔ ردا نے تھیسز مکمل کرنے کے لئے ٹیکسلا کے آثار قدیمہ کا انتخاب کیا جہاں صدیوں پرانی داستان صفحۂ قرطاس پر ظاہر ہونے کے لئے ردا کی منتظر تھی۔ اب آگے پڑھئے۔

ایک ہفتہ آرام اور دواؤں سے طبیعت بہتر ہوئی۔ سردی کی شدت پہلے سے زیادہ تھی۔ ٹیکسلا جانے کے لئے گھر سے سخت ہدایات کے ساتھ مشروط اجازت ملی۔ بہن روما اور بہنوئی اسماعیل میری ڈھال بنے رہے۔

دھرما راجیکا کی طرف جاتے ہوئے خوف کا غلبہ تھا۔ سوچا کہ کام ''جولیان'' میں بھی کرنا ہے لہٰذا پہلے وہاں چلی جاتی ہوں۔ جولیان کا شمار بدھ مت کی قدیم خانقاہوں میں ہوتا ہے۔ یہ ضلع ہری پور، خیبر پختونخوا کا حصہ ہے۔ پہاڑ کی بلندی پر واقع خانقاہ تک پہنچے کے لئے یونیسکو کی جانب سے تعمیر کی گئی طویل سیڑھیاں چڑھنا پڑتی ہیں۔ ڈرائیور بابا میرے ساتھ اوپر جانے پر اصرار کرتے رہے مگر اتنی بلندی تک جانا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ لہٰذا انہیں اطمینان دلاتے ہوئے اوپر کی جانب چل دی۔ سیڑھیاں ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ اوپر پہنچی تو سناٹے کا راج تھا۔ شاید وجہ یہ تھی کہ آج چھٹی کا دن نہیں تھا۔ ویسے بھی کھنڈرات سے دل چسپی رکھنے والے لوگ کم ہوتے ہیں۔

خانقاہ کا مرکزی اسٹوپا بند تھا۔ بوڑھا چوکیدار نظر آیا۔ مجھے دیکھ کر پہلے بوکھلایا پھر ہنستے ہوئے بولا، بی بی جی باہر سے آئی ہو؟ میں نے آرکیالوجی ڈپارٹمنٹ کی جانب

سے ملنے والا اجازت نامہ اسے تھمایا۔ لیٹر ہیڈ دیکھ کر وہ میرے آنے کا مقصد سمجھ گیا۔

بی بی جی کہو تو اسے کھول دوں، جتنی دیر چاہو کام کرو۔ میں یہیں ہوں بے پھکر ہو کر پڑھائی کرو۔ خانقاہ کے مرکزی اسٹوپا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

میرا زیادہ کام مرکزی اسٹوپا سے منسلک تھا۔

چوکیدار نے تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے جیب سے چابی نکالی اور گرل والے دروازہ کا تالا کھول دیا۔

اندر داخل ہوئی تو اس نے پیچھے سے آواز دی، بی بی جی میرا جوڑی دار نئیں آیا۔ اس کی جورو بیمار ہے۔ کہو تو اتنے میں کھانا کھا کے آجاؤں۔ دروا جا اندروں بن کر لیو۔ ہر کسی نو اندر جان دی اجازت نئیں اے۔

یہ اطلاع تھی یا اجازت، میں سمجھ نہیں سکی۔ حیران و پریشان سوالیہ نظروں سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ ذہن میں آنے والے اندیشوں کو جھٹکا اور اندر سے کنڈی لگا کر کام میں منہمک ہوگئی۔

ہر طرف بتوں کے مجسمے تھے۔ اسٹوپا کی ناپ تول اور پیمائش کے بعد دیوار پر آویزاں سب سے بڑے مجسمہ کے نمونے لیتے وقت کہیں دور سے ہلکے ہلکے نقارے بجنا شروع ہوئے۔ انہاک کی وجہ سے آواز کی طرف دھیان نہیں گیا لیکن مجسمہ کے معائنہ کے دوران اس وقت رگ و پے میں خوف کی لہر دوڑ گئی جب اس کے ماتھے پر دائیں طرف کسی وقت میں نکالے گئے قیمتی پتھر کے خلا سے سرخ روشنی دکھائی دی۔ روشنی پھیلنے لگی اور پھیلتے پھیلتے کمرے پر محیط ہوگئی۔ ذہن نقاروں کی طرف متوجہ ہوا، آواز تیز ہوتی جارہی تھی۔ آسیب زدہ ماحول سے بھاگنے کے لئے تیزی سے بیگ کی طرف لپکی۔ دروازہ کھلنے کی زوردار آواز آئی۔ پلٹ کر دیکھا تو دروازہ بند تھا۔ دل حلق میں آگیا اور چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

دروازہ کی طرف دوڑ لگائی تو سامنے وہی نوجوان زرق برق لباس میں دکھائی دیا اور شاہانہ انداز سے چلتا ہوا چند فٹ فاصلہ پر کھڑا ہوگیا۔ میں نے ہمت کرتے ہوئے پوچھا، کون ہو تم؟ زبان ہکلاہٹ کا شکار تھی۔

اس نے جواب میں کچھ کہا لیکن بھنبھناہٹ کے سوا کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ سماعت پر زور دینے سے اندازہ ہوا کہ سنسکرت میں کچھ کہا ہے اور ''کشان'' اور ''پزل'' کے الفاظ واضح ہوئے۔

آرکیالوجی سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے قدیم زمانوں اور زبانوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس سلسلہ میں سنسکرت زبان کا قدیم ورژن اہمیت رکھتا ہے۔ میں اس کے کئی کورسز کر چکی تھی۔ کورسز میں قدیم زبانوں کی لغات کے ساتھ باقاعدہ کلاسیں شامل تھیں۔ اس شخص کا مجھے مخاطب کر کے کچھ سمجھانے کی وجہ سے میرا خوف کم ہوگیا تھا کہ یہ مجھے نقصان نہیں پہنچائے گا۔ سمجھنے سمجھانے کا سلسلہ جاری تھا کہ بچوں کے چیخنے

اور دوڑنے کی آوازوں کے ساتھ منظر بدل گیا۔

گھومنے پھرنے کی غرض سے بچوں کے ساتھ کچھ لوگ آ گئے تھے۔ میں نے جلدی جلدی سامان سمیٹا اور بیگ اٹھا کر باہر آ گئی۔ چوکیدار اب تک غائب تھا۔ باہر لوگ مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ گویا میں یہاں کی باقیات میں سے تھی۔

میں گرل والے دروازہ کو کنڈی لگا کر سیڑھیوں کی طرف آئی تو چوکیدار کھنکھارتا ہوا اوپر آ رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو گھگیاتے ہوئے بولا، ماپھی چاہتا ہوں بی بی جی کھانے کے بعد کمر لگائی تو نیند آ گئی۔

لگتا تھا میں ایک بار پھر دھوکا کھا گئی تھی۔ وقت زیادہ گزر گیا تھا لیکن میرے لئے نہ گزرنے کے برابر تھا۔

بیگ سے موبائل نکالتے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگی۔ ڈرائیور بابا کئی فون کر چکے تھے اور مجھے اسٹوپا میں پانچ گھنٹے لگ گئے تھے۔ نیچے پہنچی تو وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بے خبر سو رہے تھے۔ شرمندگی ہوئی کہ انہوں نے کھانا نہیں کھایا ہوگا۔ آواز دی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئے۔ راستہ سے کھانے پینے کی چیزیں خریدیں۔

آج بھی خاطر خواہ کام نہ ہو سکا تھا مگر جو کچھ پیش آیا اس نے میرا تجسس بڑھا دیا۔

وہ شخص کون تھا جو قدیم سنسکرت زبان میں مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کشان اور پزل کے الفاظ سے اندازہ ہوا کہ اس کا تعلق سینکڑوں سال پرانی تاریخ سے ہے۔ تاریخ کے ان ادوار سے میں اس وقت واقف ہوئی جب میں نے ''چندر گپت موریا'' کے دربار میں کام کرنے والے سفیر میگاستھینز کی کتاب ''انڈیکا'' کا مطالعہ کیا۔

کتاب پڑھے ہوئے کافی عرصہ بیت گیا تھا اس لئے کچھ چیزیں ذہن میں تھیں اور زیادہ حذف ہو گئیں۔

میں ایسے مسئلہ کا شکار ہو گئی تھی جو میرا نہیں تھا مگر ریسرچ کی تکمیل کے لئے مجھے اس کا سامنا کرنا پڑا۔ گھر میں تذکرہ کرنا خود پر اعلیٰ تعلیم کے دروازے بند کرنا تھا۔

راستہ ان سوچوں میں گزر گیا۔ ہارن نے متوجہ کیا، گاڑی گھر کے باہر گیٹ کھلنے کی منتظر تھی۔ اس ایک لمحہ میں فیصلہ کیا کہ میں اس معاملہ سے پیچھے نہیں ہٹوں گی۔

گھر میں داخل ہوئی تو ذہن پر سے بوجھ ہٹ گیا تھا۔ امی نے حسب عادت مسکراتے ہوئے پیار کیا اور شام کی چائے کا کہہ کر باورچی خانہ کی طرف بڑھ گئیں۔

ذہن اس بات پر مرکوز ہو گیا کہ مجھے اپنی تحقیق میں گزرے وقتوں کے اس شہزادہ کو شامل کرنا ہے جو بار بار سامنے آ کر کچھ کہنا چاہتا ہے۔

ماضی کے جھروکوں سے چھن کر آنے والی روشنی میں ان کرنوں کو تلاش کرنا تھا تا کہ وہ باب روشن ہو جس کا تعلق آزردہ حال شہزادہ سے تھا۔ میں یہ بھی سوچ رہی تھی کہ کہیں آگے چل کر مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ بظاہر یہ وسوسہ تھا مگر کوئی راہ نما نہ ہو تو رکاوٹ اپنے ساتھ وسوسوں کی بارات لے کر آتی ہے۔ راہ نما

وسوسوں سے بچا کر نکالنا خوب جانتے ہیں۔

اب اصل بات راہ برکی تلاش تھی جس کے بغیر یہ سفر ممکن نہیں تھا۔ میں نے وضو کیا۔ لطافت اور پاکیزگی کے احساس نے طبیعت کا بوجھل پن دور کر دیا۔

نماز کے بعد خشوع وخضوع کے ساتھ دست طلب دراز کیا کہ یا اللہ! قرآن کریم میں ہے کہ جو اللہ کے لئے جدوجہد کرتا ہے، اللہ اس پر اپنی راہیں کھول دیتا ہے۔ زبان پر سورہ عنکبوت کی آیت کی تکرار تھی، طبیعت پر رقت طاری ہوگئی اور آنسو بہہ نکلے۔

دعا میں ارتکاز اور رقت پیدا ہوئی تو میں بے اختیار سجدہ میں چلی گئی۔ رب کے حضور گڑگڑا رہی تھی۔ لگتا تھا اللہ تعالی کی محبت وشفقت نے مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا ہے۔ نجانے کتنی دیر یہ کیفیت رہی۔

امی نے آواز دی۔ جلدی جلدی منہ دوبارہ دھوکر ڈائننگ روم میں آ گئی۔ وہ کافی دیر سے انتظار کر رہی تھیں۔ دیکھتے ہی شکوہ کیا، کیا بات ہے ردا اتنی دیر لگادی، چائے ٹھنڈی ہوگئی ہے۔

امی نماز کا وقت نکل رہا تھا۔

بیٹا میں کئی دن سے دیکھ رہی ہوں تم خاموش اور سنجیدہ ہو اور زیادہ وقت کمرے میں گزارتی ہو۔ طبیعت ٹھیک ہے نا۔ روما نے بھی محسوس کیا ہے۔ چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے پوچھا، کیا آپی نے کچھ کہا؟

وہ کیا کہے گی، ملنے آتی ہے تو تم پہلے کی طرح بات نہیں کرتیں۔ خود کو اتنا مصروف کر لیا ہے۔ امی کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ کسی نے گیٹ زور زور سے پیٹا پھر گھنٹی بجائی۔ لگتا تھا کہ گھنٹی بجانے والا بہت جلدی میں ہے یا گھنٹی بجانے کے آداب سے بے خبر ہے۔

امی نے فکرمندی سے کہا، اوہو یہ کون آ گیا، میں نے چوکیدار اور ڈرائیور دونوں کو بازار بھیجا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ خود دروازہ کھولنے جاتیں، میں نے میز پر امی کے بٹوے میں سے نوٹ نکالا اور تیزی سے یہ کہتے ہوئی باہر آئی کہ لگتا ہے کوئی مانگنے والا ہے۔

پیچھے سے امی نے آواز دی، بیٹا دروازہ نہیں کھولنا۔

میں نے جی اچھا کہہ کر دروازہ میں بنے آئی ہول کا کور ہٹا کر پوچھا، کون ہے؟

نہایت مکروہ صورت بوڑھا جس کے بے ترتیب اور بکھرے ہوئے لمبے بالوں میں دھول اٹی ہوئی تھی، کپڑوں کا رنگ میل کچیل نے تبدیل کر دیا تھا، سامنے آیا اور قہر آلود موٹی موٹی سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے چیخا— وہ میرا شکار ہے، دور رہ اس سے ورنہ چوٹ کھائے گی میرے ہاتھوں!

غضب ناک انداز میں ہاتھ لہرا کر گرج رہا تھا۔ میں مبہوت اور سکتہ کی سی کیفیت میں اسے دیکھ رہی تھی۔

پھر وہ پلٹا اور اوجھل ہوگیا۔

کون تھا، کہاں سے آیا اور کہاں چلا گیا—؟

تجسس میں چھوٹا دروازہ کھول کر باہر آئی مگر دور دور

تک سڑک سنسان تھی۔ امی دروازہ کھولنے کی آواز سن کر لان میں آ گئیں اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے ڈانٹنے لگیں۔ تم اپنی عادتوں سے باز نہ آنا، کسی بات سے ڈرتی نہیں، دروازہ بھاڑ سا کھول کر کھڑی ہوگئی ہو۔

میں دروازہ بند کر کے پلٹی اور ان کا ہاتھ پکڑ کر اندر آ گئی۔ آج کل کے بچے شرارتی ہوگئے ہیں امی، کوئی بچہ دروازہ بجا کر بھاگا ہے۔ وہ مشکوک انداز سے گھورتے ہوئے بولیں، اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔

اب میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ میں نے اداکاری کرتے ہوئے کندھے اچکائے۔ جلدی جلدی چائے پی اور آرام کا کہہ کر کمرے میں آ گئی۔ امی کو تو مطمئن کر دیا مگر خود پریشان ہوگئی تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

پہیلیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ بار بار ذہن بزرگ کی طرف چلا جاتا۔ وہ راہ نمائی کر سکتے ہیں کہ یہ سب کیا اور کیوں ہو رہا ہے۔ انہیں تلاش کرنا ہوگا۔

رات مراقبہ میں بیٹھی تو میں نے بچپن کی سہیلی نیلم کے ہم راہ خود کو بزرگ کے روبرو دوزانو باادب دیکھا۔ ان کے قلب سے دودھیا روشنی کی دھار میرے سر میں جذب ہو رہی تھی۔ مراقبہ کے بعد نیند میں بھی مراقبہ کا تسلسل برقرار تھا۔ مراقبہ کی کیفیات کی وجہ سے طے کر لیا کہ کچھ بھی ہو پہلے نیلم کا گھر تلاش کیا جائے۔ اگلے روز والدہ سے بمشکل اجازت ملی۔ ان لوگوں نے گھر تبدیل کر لیا تھا۔ نئے مکانات بننے اور پرانے مکانات تبدیل ہو جانے کے باعث نقشہ بدل گیا تھا۔

ذہن میں تیزی سے خیال گزرا کہ نیلم کے والد سرکاری افسر تھے اور وہ اکثر پنڈی صدر میں ان کے آفس کا ذکر کرتی تھی۔ وہ شفیق اور ملنسار طبیعت کے مالک تھے۔ کیوں نہ دفتر سے پتہ حاصل کیا جائے۔ مگر ڈرائیور بابا کے چہرہ سے تھکن اور بیزاری عیاں تھی۔ لہٰذا تلاش کا سلسلہ کل تک موقوف کر کے ہم واپسی کے لئے پلٹے۔ (قسط:۳)

عدم کا راز

دنیا میں ہر وقت اللہ کے ایسے بندے موجود رہتے ہیں جو شہود اور باطنی نعمت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ جب وہ دنیا میں اکثریت کے عمل کا تجزیہ کرتے ہیں تو انہیں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ لوگ چند روزہ زندگی کو اصل سمجھے ہوئے ہیں۔ لیکن جلد ہی اس کی وجہ بھی ان کی نظر میں آ جاتی ہے اور وہ بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ بے خودی — خودی سے اور موت زندگی سے اعلیٰ تر ہے۔ لیکن دنیا کے باسیوں پر عدم کا یہ راز روشن نہیں ہے کہ اصل زندگی وہی ہے جو مرنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اس مخفی راز کی وجہ سے ہی دنیا میں آدم کی دل چسپی قائم ہے۔ اگر آدم زاد پر دنیا کی بے ثباتی روشن ہو جائے تو عارضی زندگی اور دنیا سے دل اچاٹ ہو جائے گا۔ (کتاب: کشکول)

ادارہ

اولی الالباب بچے

اللہ تعالیٰ چھپا ہوا خزانہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ مخلوق مجھے پہچانے تو محبت سے مخلوق کو تخلیق کیا اور کائنات بنائی۔ کائنات اور جو کچھ اس میں ہے وہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے واقف ہونے کی نشانیاں ہیں۔ جو چھوٹے اور بڑے بچے غور وفکر کرتے ہیں وہ اولی الالباب (عقل ودانش والے) کہلاتے ہیں۔ بچو! ذہن استعمال کریں، سوچیں اور جو جواب ذہن میں آئے، ہمیں بھیج دیں۔ ہمارا پتہ ہے: بچوں کا قلندر شعور، عظیمی محلّہ، سرجانی ٹاؤن، کراچی۔

پیارے بچو! بتایئے عقل بڑی یا بھینس ــــ؟

مالک بھینس کی رسی باندھنا بھول گیا۔ بھینس نازو انداز سے چلتے ہوئے کھیت کی طرف نکل گئی اور جی بھر کر ہری فصل کھائی۔ پھر درخت کے سائے میں بیٹھ کر جگالی کرنے لگی۔ بچو! کھانا معدہ میں جاتے ہی ہضم ہونے کا عمل شروع ہو جاتا ہے لیکن گائے بھینس کا کھانا ایک دفعہ میں ہضم نہیں ہوتا۔ معدہ میں جانے کے بعد واپس منہ میں آتا ہے، وہ کھانے کو پھر سے آہستہ آہستہ چباتے ہیں ــــ اس عمل کو جگالی کہتے ہیں۔

بھینس درخت کی چھاؤں میں آرام کر رہی تھی کہ عقل اٹھلاتی ہوئی آئی اور بولی، سب نے کوشش کر لی لیکن بتا نہیں سکے کہ عقل بڑی یا بھینس۔ بھینس بولی، غوووااں ں ں ں ں۔ یہ کون سا مشکل سوال ہے، ظاہر ہے میں بڑی ہوں۔ میرا قد کاٹھ اور حجم (سائز) دیکھ لو۔ جب کہ بی عقل! تمہارا وجود باتوں تک محدود ہے۔ کیا کسی نے دیکھا ہے تمہیں ــــ؟

اتنے میں مالک بھینس کو ڈھونڈتا ہوا پہنچا اور فصل کا حال دیکھ کر سر پیٹ لیا۔ کھیت کے مالک سے معافی مانگی اور بھینس پر ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے گھر پہنچ کر اسے درخت سے باندھ دیا۔ عقل نے یہ دیکھا تو بولی، ایسی طاقت کا کیا فائدہ جو پورا دن درخت سے بندھی رہے۔ یہ کہہ کر وہاں سے چلی آئی۔

پیارے بچو! آپ بتایئے کہ عقل بڑی ہے یا بھینس ــــ؟ اور کیوں ــــ؟

جولائی 2019ء میں سوال کیا گیا کہ ہر ستارہ ایک دنیا ہے جس میں مخلوق آباد ہے۔ان ستاروں کو گنیں اور بتائیں کہ ہماری زمین کے علاوہ آسمان میں اور کتنی دنیائیں ہیں؟

حیدر خان (کراچی): آسمان ستاروں کا گھر ہے۔ جب دنیا والے سو جاتے ہیں، اس وقت ستاروں کی صبح ہوتی ہے۔ میں نے 500 ستارے گنے۔ گنتی کے دوران بھول گیا کہ میں کہاں کھڑا ہوں۔ توجہ زمین سے ہٹ گئی۔ مشق کے بعد میں نے خواب میں ایک ستارہ کو ہاتھ لگایا۔ چمک کی وجہ سے نظر نہیں آیا کہ اس کے اندر کیا ہے۔

زوہیب (فیصل آباد): آج کل آسمان میں ستارے چھپے ہوئے ہیں اس لئے میں نے صرف 166 ستارے گنے۔

نمرہ زینب، فرحین، اریبہ محسن: جس طرح ہم اس دنیا میں رہتے ہیں اس طرح اور بھی دنیائیں ہیں۔ وہاں پر انسان اور اس دنیا کی طرح مخلوقات رہتی ہیں۔ وہ لوگ بھی انبیائے کرام کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوں گے کیوں کہ آسمانی کتابیں ان پر بھی نازل ہوئی ہیں۔ وہاں بھی آپؐ کی نشانیاں ضرور ہوں گی کیوں کہ حضور پاکؐ تمام عالمین اور مخلوقات کے لئے رحمت ہیں۔

عائشہ محسن (فیصل آباد): ابا جان، میں نے 20 ستارے گنے، اس کے بعد مجھے گنتی نہیں آتی۔

شامہ، عبیرہ، زعیم، زوار، عمار (کراچی): ہم نے بالترتیب 17، 14، 14، 5، 10 ستارے دیکھے۔

نور العین، جماعت چہارم (اٹک): میں نے تین رات تک ستارے گنے لیکن ہر رات تعداد الگ تھی۔ کبھی 14، کبھی 30، کبھی 80۔ ستارے بہت چھوٹے ہیں، کیا ان میں بھی ہماری دنیا کی طرح بڑی دنیا آجاتی ہے؟

نور عجم، جماعت پنجم: میں نے تقریباً 203 ستارے گنے ہیں۔

دعا۔ جماعت ہفتم: آسمان میں لاشمار ستارے ہیں جنہیں ہم اس وقت گن سکتے ہیں جب ہم روحانیت سے واقف ہو جائیں گے۔ میں صرف 665 ستارے گن سکی۔ پہلی نظر میں سب کو تین یا چار ستارے نظر آئے۔ غور سے دیکھا تو سارے آسمان پر ستارے نظر آنا شروع ہو گئے۔

سمعیہ رفیق (لاہور): رات دس بجے آسمان کو دیکھا تو 20 ستارے گن سکی۔ گرمیوں کے دن ہیں اس لئے ہم چھت پر سوئے۔ آدھی رات کو آنکھ کھلی تو آسمان ستاروں سے سجا ہوا تھا۔ میں نے 428 ستارے گنے۔

ذویان محسن (فیصل آباد): کیا ہر ستارہ میں وہ تمام وسائل ہیں جو ہماری دنیا میں ہیں؟ ان کی بھی مختلف زبانیں ہوں گی۔ میں نے ایک دفعہ تین ستاروں کو باتیں کرتے دیکھا تھا۔

بڑا آدمی

اردو زبان کی ترقی میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ پاکستان میں اردو کو اہمیت دی جائے اور بچے اور بڑے شائستہ اردو میں بات کریں۔ اردو زبان کے لئے خدمات کی وجہ سے انہیں بابائے اردو کا خطاب دیا گیا۔ اردو کے فروغ کے لئے کراچی میں ''وفاقی اردو سائنس کالج'' قائم کیا جو اب یونی ورسٹی بن چکا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کا مشہور قول ہے،

''پڑھنے سے پڑھنا، لکھنے سے لکھنا اور بولنے سے بولنا آتا ہے۔''

نام دیو ــــ مقبرۂ رابعہ درانی* اورنگ آباد (دکن) کے باغ میں مالی تھا۔ مقبرہ کا باغ میری نگرانی میں تھا۔ میرے رہنے کا مکان بھی باغ کے احاطہ میں تھا۔ میں نے اپنے بنگلے کے سامنے چمن (باغ) بنانے کا کام نام دیو کے سپرد کیا۔ میں اندر کمرے میں کام کرتا رہتا تھا۔ میری میز کے سامنے بڑی سی کھڑکی تھی اس میں سے چمن صاف نظر آتا تھا۔ لکھتے لکھتے کبھی نظر اٹھا کر دیکھتا، نام دیو کو ہمہ تن کام میں مصروف پاتا۔ بعض وقت اس کی حرکتیں دیکھ کر تعجب ہوتا۔ مثلاً کیا دیکھتا ہوں کہ نام دیو گملا صاف کر رہا ہے۔ پھر پودا ڈال کر مٹی بھری۔ حوض سے پانی لیا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا۔ پانی ڈال کر ڈول (وضع) درست کی اور ہر رخ سے پودے کو مڑ مڑ کر دیکھا۔ پھر الٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگا، دیکھتا جاتا، مسکراتا اور خوش ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی اور خوشی بھی۔

کام اسی وقت ہوتا ہے جب اس میں لذت آنے لگے۔ بے مزا کام، کام نہیں بیگار ہے۔ اب مجھے اس سے دل چسپی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بعض وقت کام چھوڑ کر اسے دیکھا کرتا مگر اسے کچھ خبر نہ ہوتی کوئی دیکھ رہا ہے یا اس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں مگن رہتا۔

اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ پودوں اور پیڑوں ہی کو اپنی اولاد سمجھتا تھا اور اولاد کی طرح ان کی

---

* رابعہ درانی (شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی بیگم)

پرورش اور نگہداشت کرتا۔ ان کو سرسبز اور شاداب دیکھ کر ایسا خوش ہوتا جیسے ماں اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ وہ ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا، ان کو پیار کرتا، جھک جھک کر دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا اس سے چپکے چپکے باتیں کر رہا ہے! جیسے جیسے وہ بڑھتے، پھولتے اور پھلتے، اس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا تھا۔ ان کو توانا دیکھ کر اس کے چہرہ پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ کبھی کسی پودے میں اتفاق سے کیڑا لگ جاتا یا کوئی اور روگ پیدا ہو جاتا تو اسے بڑی فکر ہوتی۔ بازار سے دوائیں لاتا۔ باغ کے داروغہ یا مجھ سے کہہ کر منگواتا۔ دن بھر اسی میں لگا رہتا اور اس پودے کا ایسا خیال کرتا جیسے کوئی ہم درد اور نیک دل اپنے عزیز کا کرتا ہے۔ ہزار جتن کرتا اور اسے بچا لیتا۔ جب تک وہ تن درست نہ ہو جاتا، اسے چین نہ آتا۔ اس کے لگائے ہوئے پودے ہمیشہ پروان چڑھے اور کبھی کوئی پیڑ ضائع نہ ہوا۔

باغوں میں رہتے ہوئے اسے جڑی بوٹیوں کی شناخت ہو گئی تھی۔ خاص کر بچوں کے علاج میں بڑی مہارت تھی۔ دور دور سے لوگ اس کے پاس بچوں کے علاج کے لئے آتے تھے۔ وہ باغ میں سے جڑی بوٹیاں لا کر شفقت سے ان کا علاج کرتا۔ کبھی کسی دوسرے گاؤں والے بھی اسے علاج کے لئے بلا لے جاتے۔ بلا تامل چلا جاتا۔ مفت علاج کرتا اور کبھی کسی سے کچھ نہیں لیتا تھا۔ وہ خود بھی بہت صاف ستھرا رہتا تھا اور ایسا ہی اپنے چمن کو رکھتا۔ اس قدر پاک صاف جیسے رسوئی کا چوکا (سل)۔ کیا مجال جو کہیں گھاس پھوس یا کنکر پتھر پڑا رہے۔ روشیں (وضع) باقاعدہ، گملے درست، سنچائی اور شاخوں کی کانٹ چھانٹ وقت پر، جھاڑ نا صبح شام روزانہ۔ غرض سارے چمن کو آئینہ بنا رکھا تھا۔

باغ کے داروغہ (عبدالرحیم خاں فینسی) خود بھی کارگزار اور مستعد شخص ہیں اور دوسروں سے بھی کھینچ تان کر کام لیتے ہیں۔ اکثر مالیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے ورنہ ذرا بھی نگرانی میں ڈھیل ہوئی، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے یا سائے میں جا لیٹے۔

عام طور پر آدمی فطرتاً کاہل اور کام چور واقع ہوا ہے۔ آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہو گئی ہے۔ لیکن نام دیو کو کبھی کچھ کہنے سننے کی نوبت نہ آئی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگا رہتا۔ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔

ایک سال بارش بہت کم ہوئی، کنوؤں اور باولیوں (پکا کنواں) میں پانی برائے نام رہ گیا۔ باغ پر

آفت ٹوٹ پڑی۔ بہت سے پودے اور پیڑ تلف (برباد) ہو گئے۔ جو بچ رہے وہ ایسے نڈھال اور مرجھائے ہوئے تھے جیسے دق کے بیمار لیکن نام دیّو کا چمن ہرا بھرا تھا۔ وہ دور دور سے ایک ایک گھڑا پانی کا سر پر اٹھا کے لاتا اور پودوں کو سینچتا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قحط نے لوگوں کے اوسان خطا کر رکھے تھے اور انہیں پینے کو پانی مشکل سے میسر آتا تھا۔ یہ خدا کا بندہ کہیں نہ کہیں سے پانی لے ہی آتا اور پودوں کی پیاس بجھاتا۔ جب پانی کی قلت بڑھی تو اس نے راتوں کو بھی پانی ڈھونڈ ڈھونڈ کر لانا شروع کیا۔ پانی کیا تھا یوں سمجھئے کہ آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی۔ لیکن یہی گدلا پانی پودوں کے حق میں آبِ حیات تھا۔ میں نے اس بے مثل کارگزاری پر اسے انعام دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کا کہنا ٹھیک تھا کہ اپنے بچوں کے پالنے پوسنے میں کوئی انعام کا مستحق نہیں ہوتا۔ کیسی ہی تنگی ترشی ہو وہ ہر حال میں کرنا ہی پڑتا ہے۔

جب اعلیٰ حضرت حضور نظام کو اورنگ آباد کی خشک آب و ہوا میں باغ لگانے کا خیال ہوا تو یہ کام ڈاکٹر سید سراج الحسن (نواب سراج یار جنگ بہادر مرحوم) ناظم تعلیمات کو تفویض ہوا۔

ڈاکٹر صاحب کا ذوق باغ بانی مشہور تھا۔ مقبرۂ رابعہ درانی اور اس کا باغ جو اپنی ترتیب و تعمیر کے اعتبار سے مغلیہ باغ کا بہترین نمونہ ہے، مدت سے ویران اور سنسان پڑا تھا، وحشی جانوروں کا مسکن تھا اور جھاڑ جھنکاڑ سے بھرا پڑا تھا، آج ڈاکٹر صاحب کی بدولت سرسبز و شاداب اور آباد نظر آتا ہے۔ اب دور دور سے لوگ اسے دیکھنے آتے اور سیر و تفریح سے محظوظ ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو آدمی پرکھنے میں کمال تھا۔ وہ نام دیّو کے قدردان تھے۔ اسے مقبرہ سے شاہی باغ میں لے گئے۔ شاہی باغ آخر شاہی باغ تھا۔ کئی کئی نگران کار اور بیسوں مالی، اور مالی بھی کیسے کیسے، ٹوکیو سے جاپانی، تہران سے ایرانی اور شام سے شامی آئے تھے۔ ان کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اختراع تھی۔ وہ شاہی باغ کو حقیقت میں شاہی باغ بنانا چاہتے تھے۔ یہاں بھی نام دیّو کا وہی رنگ تھا۔ اس نے فن باغ بانی کی کہیں تعلیم پائی تھی اور نہ اس کے پاس کوئی سند یا ڈپلوما تھا۔ البتہ کام کی دھن تھی، کام سے سچا لگاؤ تھا اور اسی میں اس کی جیت تھی۔ شاہی باغ میں بھی اس کا کام مہا کاج (شاہ کار) رہا۔ دوسرے مالی

لڑتے جھگڑتے، یہ کسی سے لڑتا جھگڑتا نہیں تھا۔
بس وہ تھا اور اس کا کام۔

ایک دن نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کی یورش ہوئی۔ سب مالی بھاگ بھاگ کر چھپ گئے۔ نام دیو کو خبر بھی نہ ہوئی کیا ہو رہا ہے۔ وہ برابر اپنے کام میں لگا رہا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ قضا سر پر کھیل رہی ہے۔ مکھیوں کا غضب ناک جھلڑ (غول) اس غریب پر ٹوٹ پڑا۔ اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا۔ آخر اسی میں جان دے دی۔ میں کہتا ہوں کہ اسے شہادت نصیب ہوئی۔ وہ سادہ مزاج، بھولا بھالا اور منکسر مزاج تھا۔ اس کے چہرہ پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھک کر ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی، اس پر بھی بساط سے بڑھ کر اپنے غریب بھائیوں کی مدد کرتا رہتا تھا۔ کام سے عشق تھا اور آخر کار کام کرتے کرتے دنیا سے رخصت ہو گیا۔

گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا سایہ، وہ دن رات برابر کام کرتا رہا لیکن اسے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میں بہت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے۔ اسی لئے اسے کبھی اپنے کام پر فخر یا غرور نہ تھا۔ وہ یہ باتیں جانتا ہی نہ تھا۔ اسے کسی سے بیر تھا نہ جلاپا۔ وہ سب کو اچھا سمجھتا اور سب سے محبت کرتا تھا۔ وہ غریبوں کی مدد کرتا، وقت پر کام آتا، آدمیوں، جانوروں، پودوں کی خدمت کرتا لیکن اسے کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔

نیکی اسی وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ جہاں اس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی — نیکی نہیں رہتی۔

جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے اور بڑا آدمی کسے کہتے ہیں۔ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔

درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش میں آدمی انسان بنتا ہے۔ یہ سمجھو کندن ہو جاتا ہے۔

حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہو گی خدا پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی، اللہ کے بندوں کو اس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔

لوہا اور پیاز

خلیفہ ہارون رشید عباسی دور کے پانچویں خلیفہ تھے۔ان کے عہد میں بغداد میں علمی وفنی اعتبار سے بہت ترقی ہوئی۔اس دور میں مسلمان علمی میدان میں بہت آگے نکل گئے۔خلیفہ ہارون اوران کے بیٹے مامون الرشید نے عظیم الشان لائبریری ''بیت الحکما'' بنائی جو اپنی مثال آپ تھی۔چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان کی قیادت میں منگولوں نے 1258ء میں بغداد پر حملہ کیا تو اس لائبریری کو تباہ کر دیا گیا۔ بیت الحکما میں ہزاروں کتابیں تھیں۔

پیارے بچو! کسی قوم کا زوال اس وقت شروع ہوتا ہے جب اس کے پاس علم کی دولت ہو لیکن وہ غور وفکر نہ کرے اور علم سے لاپروائی برتے۔

خلیفہ ہارون کی بیگم کا نام ملکہ زبیدہ تھا۔انہوں نے حاجیوں کی آسانی کے لئے مکہ سے بغداد تک طویل نہر کھدوائی جو نہر زبیدہ کے نام سے مشہور ہے۔انجینیئروں نے بتایا کہ نہر پر بہت خرچہ آئے گا لیکن ملکہ زبیدہ نے پروانہیں کی اور کہا، نہر کی تعمیر کے لئے اگر کدال کی ایک ضرب پر ایک دینار دینا پڑے تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ملکہ کے عزم کی وجہ سے نہر کی تعمیر مکمل ہوئی۔

اس زمانہ میں ایک مجذوب بزرگ بہلول داناؒ کے نام سے مشہور تھے۔لوگوں سے بے نیاز ہمیشہ حق بات کہتے تھے۔لوگوں کو ان کی باتیں سمجھ میں نہ آتیں تو کہتے کہ بہلول مجنوں ہوگیا ہے۔اس کے باوجود ہر طبقہ کے لوگ حضرت بہلول داناؒ سے مشورہ لینے آتے تھے۔

ایک مرتبہ ملکہ زبیدہ اور خلیفہ ہارون رشید دریا کنارے سیر کر رہے تھے۔حضرت بہلول داناؒ بھی وہاں موجود تھے اور ریت سے گھر بنا رہے تھے۔ملکہ زبیدہ ان سے واقف تھیں۔

پوچھا، بابا بہلول! کیا بنا رہے ہو؟

حضرت بہلول داناؒ نے فرمایا: میں جنت میں گھر بنا رہا ہوں۔

یہ سن کر ملکہ نے پوچھا: کیا یہ گھر بیچو گے؟

حضرت بہلول داناؒ نے فرمایا: ہاں بیچوں گا۔

پوچھا: ایک گھر کی کیا قیمت ہے؟

جواب دیا: گھر کی قیمت ایک دینار ہے۔

ہارون رشید نے ملکہ زبیدہ کا مذاق اڑایا کہ جنت میں گھر خرید رہی ہو، وہ بھی ایک فقیر سے اور ایک دینار میں۔ ملکہ نے خلیفہ کی بات نظر انداز کر دی اور حضرت بہلولؒ کو ایک دینار دے کر واپس ہوئیں۔

خلیفہ ہارون الرشید نے خواب دیکھا.....

''جنت میں انتہائی خوب صورت محل ہے جس پر زبیدہ خاتون کا نام لکھا ہوا ہے۔ اپنی ملکہ کا نام دیکھ کر محل میں داخل ہونا چاہا مگر دربانوں نے روک دیا کہ زبیدہ خاتون کی اجازت کے بغیر محل میں داخلہ منع ہے۔''

خلیفہ ہارون الرشید کی آنکھ کھل گئی۔ اگلے روز دریا کنارے گئے۔ حضرت بہلولؒ کل کی طرح آج بھی ریت سے گھر بنا رہے تھے۔

خلیفہ نے پوچھا، کیا کر رہے ہو؟

فرمایا، جنت میں گھر بنا رہا ہوں۔

پوچھا، کیا اسے فروخت کرو گے؟

فرمایا، ہاں فروخت کروں گا۔

پوچھا، کتنے میں؟

فرمایا، دس دینار میں۔

خلیفہ نے حیران ہوتے ہوئے کہا، مگر کل تو ایک دینار کا بیچا تھا۔ آج دس دینار میں کیوں—؟

حضرت بہلول داناؒ نے فرمایا، کل کے خریدار نے دیکھے بغیر سودا کیا۔ آج کا خریدار دیکھ کر آیا ہے۔

روایت ہے کہ ایک بار حضرت بہلول دانا محل کے پاس سے گزرے تو دیکھا کہ دروازہ پر پہرہ دار ہے نہ کوئی محافظ — وہ اندر چلے گئے۔ خلیفہ کا تخت خالی تھا، اس پر بیٹھ گئے۔ ملازموں نے تخت پر بیٹھے دیکھا تو غیر مناسب رویہ اختیار کیا۔ بہلول داناؒ ناراض ہوئے۔ خلیفہ ہارون رشید دربار میں آئے اور منظر دیکھا تو سخت لہجہ میں پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ خادموں نے تفصیل بتائی۔ خلیفہ نے سب کو ڈانٹا اور حضرت بہلولؒ کو منانے لگے۔

حضرت بہلول داناؒ نے فرمایا، میں اس بات پر ناراض نہیں کہ تمہارے لوگوں نے میرے ساتھ گستاخی کی، میں تو اس بات پر افسوس کر رہا ہوں کہ تھوڑی دیر خلافت کے تخت پر بیٹھنے سے میرا یہ حشر ہوا — تم جو اس پر پوری زندگی بیٹھو گے تمہارے ساتھ کیا ہوگا! کیا تمہیں احساس ہے؟

خلیفہ گہری سوچ میں گم ہو گیا۔

حضرت بہلول داناؒ کے پاس تاجر آیا اور عرض کیا،

شیخ بہلولؒ! نصیحت کیجئے کہ مجھے کیا خریدنا چاہئے جس سے زیادہ منافع ملے۔

انہوں نے کہا، لوہا اور روئی۔

تاجر نے ہدایت پر عمل کرتے ہوئے بڑی مقدار میں لوہا اور روئی خرید کر ذخیرہ کرلی۔ کچھ مہینہ کے بعد کاروبار میں بہت منافع ہوا۔

پیسہ آیا تو تاجر ایک مرتبہ پھر حضرت بہلولؒ کے پاس آیا اور اس بار کہا، او مجنوں بہلول! مجھے کیا خریدنا چاہئے جس سے زیادہ منافع ملے؟

(بچو! غور سے پڑھئے۔ پہلی بار تاجر نے ادب سے شیخ بہلول کہا۔ دوسری بار گستاخی کی)

حضرت بہلول داناؒ نے فرمایا، پیاز اور تربوز!

تاجر لالچی تھا۔ دولت کے نشہ میں خوب پیسہ لگایا اور پیاز اور تربوز ذخیرہ کرلئے۔ چند دنوں میں مال سڑنا شروع ہوا اور بدبو آنے لگی۔ پریشان ہوگیا۔

فوراً حضرت بہلول داناؒ کے پاس آیا اور کہا،

پہلی بار آپ نے مجھے روئی اور لوہا خریدنے کا مشورہ دیا تھا جس سے فائدہ ہوا اور میں دولت مند ہوگیا۔ دوسری بار آپ نے مجھے کس قسم کا مشورہ دیا کہ مجھے نقصان ہوگیا۔

حضرت بہلول داناؒ نے فرمایا، پہلی دفعہ تم نے مجھے احترام سے شیخ کہہ کر پکارا تھا۔ چوں کہ تم نے بحیثیت عالم مخاطب کیا تھا، اس لئے میں نے اپنے علم کے مطابق تمہیں مشورہ دیا۔ دوسری بار تم نے مجھے ”او مجنوں بہلول“ کہہ کر پکارا اس لئے مشورہ بھی اسی مناسبت سے دیا۔

تاجر بہت شرمندہ ہوا اور معافی مانگی۔

عزیز بچو! اس کہانی میں کئی کہانیاں ہیں۔ بتایئے آپ نے ان کہانیوں سے کیا سبق سیکھا؟

بچے جواب لکھ کر بھیج سکتے ہیں۔

بچو! کیا آپ کو پہیلیاں آتی ہیں ___؟ ان پہیلیوں کو بوجھیں اور جو آپ کو آتی ہیں، لکھ کر بھیجیں۔

۱۔ کھل جائے تو خوش بودار مرجھائے تو ہے بے کار ( )

۲۔ آندھی ہو یا تیز ہوا کبھی بجھے نہ ایک دیا ( )

۳۔ وہ آتا ہے وہ جاتا ہے بچھڑوں کو وہ ملاتا ہے ( )

۱۔ پھول ۲۔ سورج ۳۔ ریل

خواب تعبیر اور مشورہ

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

روحیل احمد، بہاولنگر۔ خواب میں حضرت یعقوبؑ کے زمانہ میں جنگ کا سماں دیکھا۔ آپ کی زیارت نہیں ہوئی لیکن احساس ہے کہ حضرت یعقوبؑ کا زمانہ ہے اور وہ اپنے لشکر کو جنگ کا حکم دے رہے ہیں۔ پچاس گھڑسوار آلات جنگ سے لیس اونچے پہاڑوں کی طرف روانہ ہوئے جن کے پیچھے میں پیدل چلنے لگا۔ جلد ہی وہ لشکر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ پہاڑوں میں گھنے جنگلات ہیں۔ ایک پہاڑی کی اوٹ میں اللہ کے فرستادہ بندے پیغامبر نظر آئے۔ سلام دعا کے بعد فرمایا، حضرت محمدؐ کی طرف جانے کا راستہ آگے ہے، وہاں اندھیرا ہونے کی وجہ سے پیغامبر ایک ٹارچ دیتے ہیں کہ ساتھ لے جاؤ جس کی روشنی میں چلنا شروع کردیتا ہوں۔ پہاڑوں میں ایک چھوٹا کمرا نظر آیا جس میں دیے جیسی پیلی روشنی نظر آئی، اندر سے ایک شخص آکر میرا ہاتھ پکڑ کر نبی پاکؐ کے کمرے میں لے گیا۔

تعبیر: الحمدللہ خواب سعید اور مبارک ہے۔ رسول اللہؐ پر درود وسلام کی برکت سے یہ سعادت ملتی ہے۔ نماز کی پابندی کریں۔ سورتوں کا ترجمہ یاد کرلیں۔

صدقہ

شمع ناز اختر، سرگودھا۔ دیکھا کہ ایک بھینس نلکے سے پانی پینے کی کوشش کررہی ہے لیکن پانی نہیں پی سکی۔ میں نے یہ دیکھ کر نلکا کھولا جس سے بھینس نے سیر ہوکر پانی پیا۔ پانی پینے کے بعد بھینس آدمی بن گئی۔ اس آدمی نے ہاتھ اٹھا کر مجھے دعا دی اور چلا گیا۔ اتنے میں اللہ کا ایک بندہ اور ایک عورت آئی تو اس بندہ نے عورت کو سو روپے دے کر مجھ سے کہا کہ اللہ نے یہ تمہارے نام کا صدقہ جاری کردیا ہے۔

تعبیر: جو کچھ آپ نے دیکھا ہے یہی خواب کی تعبیر ہے۔

بچہ کے کپڑے میلے ہیں

محمد صلاح الدین، اورنگی۔ مراقبہ ہال کی مسجد کے باہر کافی لوگ موجود ہیں۔ ایک بچہ کے کپڑے میلے ہیں۔ اس نے کسی صاحب سے کچھ پوچھا تو انہوں نے توجہ سے بچہ کی باتیں سن کر اسے گود میں اٹھایا اور قریب ایک کمرے میں موجود بزرگ سے ملانے لے گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ کمرے میں آگیا۔

تعبیر: خواب اچھا ہے۔ اسباق میں مزید پابندی اور یکسوہونے کی ضرورت ہے۔ ماشاءاللہ خط پڑھ

کرانداز ہ ہوتا ہے کہ آپ کے اندر روحانی علوم سیکھنے کی صلاحیت ہے ۔ پا کی نا پا کی چلتے پھرتے ہر حال میں یاحی یا قیوم شمار کئے بغیر پڑھیں ۔ رات کو سونے سے پہلے صاف ستھرے کپڑے پہن کر دو نفل ادا کریں اور اس کے بعد اسباق پڑھیں ، یک سوئی کے ساتھ مراقبہ کریں۔ مراقبہ کے بعد یااللہ یا رحمٰن یا رحیم پڑھتے پڑھتے سوجائیں۔

سید حسنین ، **تعبیر:** ادھر ادھر کے بکھرے ہوئے خیالات کی خواب میں عکاسی کی گئی ہے۔ اس قسم کے خواب اس وقت نظر آتے ہیں جب ذہن یک سو نہیں ہوتا۔ وضو کا اہتمام کیجئے اور چلتے پھرتے یاحی یا قیوم کا ورد کریں ۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو صلوٰۃ قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ذہنی یک سوئی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری نصیب ہو، آمین۔

بچہ کی لاش

اشفاق طارق ، پشاور ۔ راستہ میں ایک بچہ کی لاش پڑی ہے جس پر مکھیاں اور سرخ بھڑیں جمع ہیں ۔ وہاں سے گزرتا ہوں تو سرخ بھڑیں میرے ہاتھوں پر کاٹتی ہیں جس سے شدید درد ہوتا ہے ۔ میں فوراً دم کر کے ہاتھوں کو دیکھتا ہوں ، درد ختم ہوگیا ہے اور آنکھ کھل گئی ۔

تعبیر: مناسب ہے کہ آپ ڈاکٹر سے اپنا ٹیسٹ کرائیں ۔ cholesterol زیادہ نہیں ہونا چاہئے ۔

دربار رسالتؐ

محبوب احمد ، لیّہ ۔ خواب میں ایک بزرگ کی زیارت ہوئی لیکن سراپا واضح نہیں ۔ بزرگ پہلے کھڑے نظر آئے پھر کرسی پر بیٹھے دیکھا ۔ عرض کرتا ہوں کہ دربار رسالتؐ میں حاضری کی سعادت سے مشرف ہونے کے لیے مدد فرمائیے ۔ بزرگ فرماتے ہیں ، انشاءاللہ ۔

تعبیر: الحمدللہ خواب نہایت مبارک ہے ۔ درود شریف کی برکت سے ایسے خواب نظر آتے ہیں مزید یک سوئی کے ساتھ درود شریف کا ورد زیادہ کیجئے ۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک اعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ذہنی پراگندگی سے اپنی حفاظت میں رکھے آمین ۔

مصروفیات پر غور کریں ۔ انشاءاللہ ضمیر نشان دہی کرے گا کہ آپ کے خیالات میں ایسے تصورات شامل ہوجاتے ہیں جو اخلاقی اعتبار سے اچھے نہیں ہیں ۔ شک ، وسوسہ ، بے یقینی ، ذہنی امور کی طرف ذہن نہ جانا یا لاپروائی ہونا یہ سب وہ علامات ہیں جو ذہن کو پراگندہ کرتی ہیں ۔ خلوص نیت کے ساتھ پروگرام بنائیے کہ

۱۔ غیبت نہ کریں ۔

۲۔ ایسی صحبت میں نہ بیٹھیں جہاں پاکیزہ خیال دوست نہ ہوں ۔

۳۔ ابا اماں کو رات کو سونے سے پہلے اور صبح بیدار ہونے کے بعد سلام کریں ، سر جھکا کر ہاتھ رکھوائیں چھوٹوں سے بھی سلام میں پہل کریں ۔ کوشش کریں کہ فجر کی نماز باجماعت ادا ہو ۔ چلتے پھرتے وضو بے وضو یاحی یا قیوم کا ورد کریں ۔

صائمہ تصور، راولپنڈی۔تعبیر: خواب میں اصلاح احوال پر توجہ دلائی گئی ہے ۔ خون میں حدت کے اشارات ملتے ہیں۔ڈاکٹر سے رجوع کریں۔

رویائے صادقہ

خوشی محمد، گوجرانوالہ۔ایک شخص باغ میں کھڑا ہے اور وہیں ایک چھت پر میں بھی ہوں۔وہ کہتا ہے، اللہ کو دیکھنا ہے یا نور کو۔ میں کہتا ہوں، اللہ کو، یہ اس کی مرضی ہے جس طرح نظر آئے۔

تعبیر: خواب کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں ۔ رویائے صادقہ اور رویائے کاذبہ۔رویائے صادقہ میں ایسی اطلاعات ہوتی ہیں جو ہر طرح خیر کی طرف متوجہ کرتی ہیں ۔ رویائے صادقہ دیکھنے کے بعد آدمی کے اندر سکون اور خوشی کی لہریں ہوتی ہیں جب کہ رویائے کاذبہ میں گھبراہٹ پریشانی اور ضمیر کے خلاف دوسرے عوامل کو قبول کرنا یا ذہنی طور پر بار بار اس کا اعادہ ہونا الٹے سیدھے خیالات آنا۔رویائے صادقہ میں ہدایت ہوتی ہے۔اس ہدایت پر عمل سے بندہ کو صراط مستقیم پر زندگی گزارنے کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔

ضد اور خود غرضی

نام شائع نہ کریں۔گھنٹی بجنے پر دروازہ کھولا تو بھائی کھڑا تھا۔اس نے میرے پیروں اور کمر پر گولیاں ماریں جس سے میں لہولہان ہوگئی۔ بھائی اندر آیا اور مجھے اس حال میں دیکھ کر خوش ہوا۔اتنے میں ابو آئے اور مجھے ہسپتال لے گئے۔

ڈاکٹروں نے کہا کہ گولیاں نکالنے سے معذور ہوجائیں گی تو میں نے گولیاں نکالنے سے منع کردیا۔

جب ہم گھر واپس آئے تو بھائی کے بلانے پر اس کے دوست بھی آگئے اور انہوں نے میری کمر پر فائرنگ کردی۔ فائرنگ سے میں خونم خون ہوگئی۔خوف کے مارے میری آنکھ کھل گئی۔

تعبیر: تجزیہ کیا جائے تو نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے یعنی ہم کوئی بھی کام کرتے ہیں پہلے اس کام کا بہت ہلکا عکس جس کو عام نگاہ محسوس تو کرتی ہے دیکھتی نہیں ہے یعنی عملاً پہلی کیفیت وہم ہوتی ہے ۔ وہم کا مطلب ہے ذہن متوجہ تو ہوتا ہے لیکن نقوش واضح نہیں ہوتے ۔ وہم میں گہرائی آجاتی ہے تو وہم نقش و نگار کے ساتھ واضح ہوتا ہے۔اور یہ واضح ہونا دراصل خیال ہے۔ پہلے کسی بھی عمل یا کسی بھی شے کے بارے میں اطلاع وارد ہوتی ہے۔ بہت ہلکا سا عکس ہوتا ہے عکس میں گہرائی پیدا ہوتی ہے عمل کی فلم بن جاتی ہے۔آدمی شے دیکھتا ہے لیکن شے میں خدوخال مادی وجود میں منتقل نہیں ہوتے۔

خیال جب ایک نقطہ پر ٹھہرتا ہے تو ذہن کی اسکرین پر تصویر نمایاں ہوتی ہے جب تصویر نمایاں ہوتی ہے تو خدوخال واضح ہوجاتے ہیں یعنی ہم شے کو منجمد یا چلتا پھرتا، روتا ہنستا، پریشان حال اور مطمئن کیفیت میں مادی خول میں دیکھتے ہیں۔

مادی خول دراصل زمین کی اسکرین پر فلم میں چلتی

پھرتی، کھاتی پیتی، حرکت کرتی ہوئی تصویر ہے اور یہ تصویر ہمیں اسپیس (space) میں نظر آتی ہے۔ اسپیس سے مراد یہ ہے کہ اسکرین پر ہاتھ پیر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔لیکن یہ ایکویشن عارضی ہے۔

اس کی مثال زندہ شے کا مردہ ہونا ہے شے موجود ہے لیکن حرکت نہیں ہے۔آنکھ ہے لیکن دیکھتی نہیں، ہاتھ پیر ہیں لیکن ان میں حرکت نہیں ہوتی۔علیٰ ہٰذا القیاس یہ سب فلمی تصویر کی طرح متحرک نظر آتے ہیں۔سمجھنے کے لئے سنیما میں اسکرین پر فلم کا کردار نہایت واضح مثال ہے۔

خواب میں ایسے مناظر ہیں جس میں جذباتیت اور غصہ،احساس برتری اور احساس کم تری کے ساتھ واضح ہیں۔مزاج میں خود غرضی کی تمثالیں بھی واضح ہیں۔ ضد اور اپنی بات منوانے کے نقوش بھی ہیں۔

مشورہ: اگر رویہ میں تبدیلی نہ ہوئی تو خدانخواستہ نتائج اچھے مرتب نہیں ہوں گے۔

قیمتی پتھر

نام شائع نہ کریں۔خواب میں گھر والوں کے ساتھ پکنک منانے گئی، وہاں کمرے میں سامان رکھا تو میرے دامن میں دو قیمتی پتھر تھے جن کو احتیاط سے رکھا کہ کوئی پتھر نہ لے لے۔ جب ہم لوگ پانی کی طرف گئے تو پانی چڑھا ہوا تھا۔خیال آیا کہ جون جولائی میں پانی تیز ہوتا ہے۔محسوس ہوا کہ میں پانی میں گری لیکن کوئی نقصان نہیں ہوا۔

تعبیر: پریشان خیالی خواب میں منتقل ہو جاتی ہے تو اس قسم کے خواب نظر آتے ہیں۔اختلاف اور ناراضی کے آثار زیادہ ہیں جب کہ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ یہ ضد بحث کا نتیجہ بھی ہوسکتا ہے۔

بہترین طریقہ یہ ہے کہ اپنی کم زوریوں اور غلطیوں کا اعتراف کریں اور معافی کی طلب گار ہوں۔معافی مانگنے اور معاف کرنے سے دلی کدورت دور ہو جاتی ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہزار مرتبہ بھی توبہ پر عمل نہ ہو تو پھر اللہ سے معافی مانگ لیں۔

عقل وشعور کا پہلا مرحلہ

— کراچی۔ ایک بزرگ کو دسترخوان پر ٹرے رکھتے دیکھ کر ان کے قریب چلا گیا۔کوئی چیز لینے باہر گئے تو میں بھی ساتھ ہو گیا۔انہیں متوجہ دیکھ کر عرض کرتا ہوں کہ ضبط نفس کے دوران آپ نے کیسی غذا استعمال کی؟ سوال پوچھتے ہوئے میرے ذہن میں لطائف کا خیال ہے۔ بزرگ نے فرمایا جو کچھ گھر میں پکا وہ کھایا۔ بزرگ نے مزید کچھ بتایا جو مجھے یاد نہیں رہا۔

میں عرض کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر آپ کو یہ علم عطا کیا ہے۔ پھر دیکھا کہ ہم جس راستہ سے آئے تھے، لوگوں کے رش کی وجہ سے وہاں سے اندر نہیں جاسکے۔ بزرگ ایک دوسرے دروازہ کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں کہ ادھر سے جانا ہوگا۔ اس جگہ سے چند لوگ جارہے ہیں۔

تعبیر: خواب میں رویہ کی عکاسی ہے۔عقیدت تو

بہت ہے لیکن تعمیل میں خامی ہے۔ بچہ اسکول جاتا ہے۔ ٹیچر پڑھاتا ہے الف ب جیم۔ شاگرد سوال کرتا ہے الف ب کیوں نہیں اور ب الف کیوں نہیں؟ کیا کوئی ایسی مثال ہے جس سے طالب علم مطمئن ہو جائے۔

اس جملہ پر غور کیجئے۔

عقل و شعور کا پہلا مرحلہ تعمیل ہے۔ استاد الف کہتا ہے شاگرد اس کو قبول کر کے تعمیل کرتا ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہو، کوئی استاد کسی شاگرد کو پڑھا نہیں سکتا۔

صاحب خواب کو روحانی علوم سے دل چسپی تو ہے لیکن استاد کی تعمیل نہیں ہے۔ الف کو الف اس وقت بولا جاتا ہے یا کہا جاتا ہے یا بچہ قبول کرتا ہے جب وہ استاد کا کہنا بلا چون و چرا مانے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا آپ بتایئے پھر کیا ہوگا۔ جواب آپ کے ذہن میں ہے۔ غور و فکر کیجئے جواب سامنے آئے گا۔

سورہ کوثر

خان، کراچی۔ میرے ایک دوست نے خواب کی تعبیر معلوم کی تھی جس سے اسے ایک ایسی بیماری کا پتہ چل گیا تھا جو ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ میں نے بھی ایک خواب دیکھا ہے جس کی تعبیر معلوم کرنے کا بہت شوق ہے۔ میں نے دیکھا کہ میں سورہ کوثر پڑھ رہا ہوں، میری آنکھ کھل گئی لیکن تھوڑی دیر بعد دوبارہ سو گیا۔ خواب میں دوبارہ سورہ کوثر پڑھی۔

ماہنامہ قلندر شعور ستمبر 2019ء

آپ کے خواب اور ان کی تعبیر

پورا نام:..... والدہ صاحبہ کا نام:.....

پورا پتہ:.....

ازدواجی حیثیت:.....وزن (تقریباً):.....آنکھوں کا رنگ.....

نیند کیسی آتی ہے:.....بلڈ پریشر (نارمل/ہائی/لو):..... تاریخ پیدائش:.....

میٹھا پسند ہے یا نمکین چیزیں زیادہ مرغوب ہیں؟.....فون نمبر.....

خدانخواستہ دماغی، نفسیاتی مرض اور وہم کے مرض میں مبتلا ہوں تو ضرور لکھیں: ہاں / نہیں

مختصر حالات :.....

.....

تعبیر: اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ شکر کا مفہوم اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ اشیا کا استعمال ہے۔ من حیث القوم محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے اندر شکر کرنے کا جذبہ بھول کی نذر ہو گیا ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرنے کی طرف خواب میں متوجہ کیا گیا ہے۔

میری چھوٹی سی محبت

اقصیٰ نصر اللہ۔ اللہ کے کرم اور آپ کی دعاؤں سے حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ دوران حج جو کیفیات ہوئیں خدمت میں عرض ہیں۔ خانہ کعبہ کے اطراف آسمان پر طواف ہو رہا ہے۔ پھر دیکھا کہ ریاض الجنۃ کے قریب منبر پر آقائے دوجہاں سرورکون و مکان اللہ کے محبوب حضرت محمد مصطفیٰؐ، آپ پر کروڑوں درود و سلام ہوں، تشریف فرما ہیں۔

میں ہاتھ میں ایک سیاہ پیالہ لئے نظریں جھکائے باادب بیٹھی ہوں۔ پیالہ میں دودھ جیسی کوئی چیز ہے۔ میں بہت ادب سے سر جھکا کر عرض کرتی ہوں، سرکارؐ یہ میری چھوٹی سی محبت ہے، اس کو قبول فرمالیجئے۔

تعبیر: الحمدللہ بہت مبارک خواب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور درود شریف کی برکت سے آپ زیارت سے مشرف ہوئیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ سعادت نصیب کرے، آمین۔

ناک کے امراض

ناک میں ہڈی کا بڑھ جانا، سانس رکنا، ناک کے اندر جھلی کا خراب ہونا، خناق، ناک کے اندر مزید ہڈی کا پیدا ہونا، ناک کے اندر پھنسیاں، ناک کا تعفن اور ناک کے اندر پھوڑا ہونا۔ ان سب امراض کے لئے کسی مومی کاغذ پر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

x x x x x

x x x x x

x x x x x

یَابَدِیۡعُ یَابَدِیۡعُ یَابَدِیۡعُ

لکھ کر کاغذ کو موڑ کر تعویذ بنالیں اور موم جامہ کر کے گلے میں ڈال دیں۔ یہ تعویذ آسمانی رنگ یا سیاہ چمک دار روشنائی سے لکھا جائے۔

has no value while all their progress depends on invisible light that is *Ghaib*. Not merely this, their existence, non-existence, life and death – everything is the work of the hidden (*Ghaib*)."

Let us understand the fiction of material observations.

The sense of hearing is related to ears and auditory systems associated with them. Ears sense the pressure of sounds emitted by things as waves. The quality of sound is determined by intensity or otherwise of sound. At the interior of human ear there is a Cochlea coil which is made of a membrane. On both sides of membrane are 15,000 hairs. Sound waves enter human ear from some source and hit air drum causing vibration. This vibration is shifted to hairs on the membrane which are of varied width. Each width senses different qualities of sound and the sense of sound creates current in the sensory system of brain. Hairs present at the beginning of membrane are sensitive to light sounds and on the last side of membrane to heavy sounds. The sensitivity of different parts of membrane is shown in figure 1.

The frequencies of these sounds range from 20 to 20,000 Hz per second. According to science, human ears could not hear sound waves of less than this quantity. This may be kept in mind that the number of sound waves is many more than what is audible to human ears such as waves emitted by human brain which range from

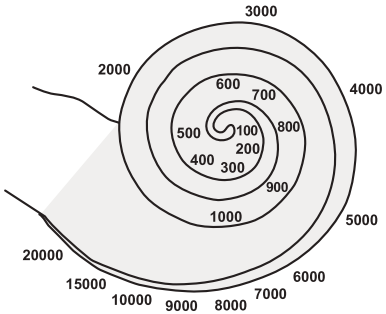

Basilar membrane in the internal ear and its vocal frequencies

12 Hz per second to 1 Hz per second. Human ears cannot feel the vibration of these waves.

In order to understand organic structure of ear, let us consider the impact of waves on human ear. When a healthy ear senses a melodious voice, the hair like cells at the first part of ear membrane produce greater quantity of current which is perceived as melodious by ears. Similarly, when a heavy voice affects hair at the later part of human ear, it is perceived as a heavy voice. It is observed that when newspaper is folded before a new-born baby he or she gets scared. The sensitivity level of hair like cells in the ears of baby is much stronger than an adult. They perceive the folding of newspaper as an explosion and get scared. If somehow hairs grow in thickness, we would not be able to hear the voice clearly. Contrary to it, if hairs become flexible, we would start hearing whistles in ears.

To be continued...

place. This could be a disease and due to an impact of some drug or medicine, one starts experiencing double vision.

Drawing our attention to the differences of images, Baba Qalandar Auliya (RA) says, “Colours are made the way as they are dispersed while watching white clothes through a prism. Similarly, shape and size appear big or small. But is there any evidence that what we see as the height of a person is his or her real height”.

The discrepancy in vision is further explained by Baba Qalandar Auliya (RA) by an example. Snake could devour a rat and digest it. This happens because of space. If snake could see the rat as big as we do, it could not muster courage to devour it. But this is not the case. It catches the rat without any reluctance and devours it as it could not see it as big as we do.

Lights also play a vital role in visual system. Our eye could see only specific quantity or frequency of light, whose wavelength is as long as 400 to 700 nanometer (a billionth part of a meter). Beyond this range, our eye could not see. It is for this reason our eye could not see in the darkness. But darkness doesn’t mean that in the absence of sunlight there is no light. Science tells us that three forms of light are present all the time during day and night called ultraviolet, infra-red and visible rays.

Our eyes could sense visible rays only. Contrary to this, rays visible for man are invisible for certain animals such as bats which cannot see in daylight. They could only sense ultraviolet and infra-red lights’ reflections. Therefore, bats see in nights as man do in day light.

The experts have invented tools with the help of which one could see ultraviolet and infra-red rays including night vision cameras and pen used to write with invisible ink. When a particular light is thrown on the ink, the material of ink and light combine to emit visible light and one could read the script.

Baba Qalandar Auliya (RA) explains that, “When our eye sees words, it is in fact light that sees words as we could not see anything else but light. When we read a book, in fact we read and understand light”.

The above means that what we see is interpreted by the understanding we possess of things. The image we make is not conclusive. The interpretation of image is discrepant. There is uncertainty. The spiritual scientists consider this interpretation or understanding, meaningless.

In this regard Mr. Azeemi says, “Science preaches that unless anything manifests itself practically, it cannot be accepted. Scientists forget the fact that they are denying their own theory. They also say that anything hidden (*Ghaib*) or which cannot be seen

The system of seeing starts with human eye. It is taught in preliminary science classes that the shape of an object enters eyes through light and then the sense of light goes to brain. The agency of brain gives meaning to information thus received. Lens plays a great role in human eye in making image in eye. Lens is made of glycosaminoglycan and collagen. God has given eye a geometry that for viewing objects at an infinite distance, its width comes down to 3.6 mm whereas the image is formed at internal retina at the distance of 24 mm. With distance, the width of lens changes. But image is always formed at the distance of 22mm to 24 mm.

According to the rules of physics, if lens' width is reduced, the image will be formed at a distance and its size will be bigger. If we see a 10 feet long tree, the image of tree will be formed at the back of lens. Due to increase in width, size of the image reduces and due to decrease in the width, size of image increases.

What do we see?

We see an image made on the lens of an eye. With change in the size of lens, the size of image increases or decreases. The question arises whether our brain is looking at a tree or an image. Then question arises what we see is the real size of the image.

According to natural law, the properties of the lens of eyes is similar among the individuals of a specie so that with reference to the prevalent ways of exchange of ideas similar standards are followed. Let us consider the case of other animals. Do other species see a 10 feet tree the way we do. The physicists reply in negative. Every specie has lenses of different capacities and qualities. Both human eyes could see within the circumference of 210^{o} whereas a dragonfly sees in full circle of 360^{o} both forward and rear. Similarly, the sight of an eagle is 240^{o} in circumference. It can see in great detail.

The visual system of all the animals depend on the following factors:

- Geometry of convex mirror
- Material inside convex mirror i.e. Collagen
- Material of retina i.e. rods and cones
- The nature of light entering an eye from outside

An image is formed out of these four factors. If there is a change in these factors, the meaning of image will change. In daily life there are instances when man could not distinguish between colours given change in the material of retina. Similarly, due to change in the material of convex mirror, the image is formed out of

What Do We See?

We see an image made on the lens of an eye. With change in the size of lens, the size of image increases or decreases. The question arises whether our brain is looking at a tree or an image.

Baba Qalandar Auliya (RA) says, "We see, hear, understand and touch through light. Light gives us senses. The senses which give knowledge are based on lights if there are no lights, there will be no senses. We will cease to observe ourselves and will not be able to see any other object".

Considering the above, eye sees light. Knowledge sought through observations and experiments is science. Five senses and things invented using senses are useful in seeking knowledge. Among these inventions are telescope, thermometer, mobile phone and video camera etc. What we witness while observing objects and, in other words, what do we understand? Baba Qalandar Auliya (RA) explains this as follows:

"God's knowledge is encircling the Universe. Every grain of this Universe exists in God's *Noor* as space. The viewers could not see God's *Noor*. They could only see universe's space which they call sun, moon, earth, sky, man, animal etc."

While explaining the theory of relativity, the British mathematician and philosopher, Bertrand Russell said that if an extra-terrestrial creature visits earth, finds a sunflower and asks various species on earth about its colour, man would identify it as yellow, animals brown and an insect, purple. Having heard so varied observations, the creature would wonder as to what would be the actual colour of sunflower?

There are five sources of observation including eye, ears, nose, tongue and skin which sense foreign objects and convey it to brain which processes this information. It, nevertheless, happens that these organs could not sense objects but experiments and knowledge generated by them help interpret these objects in the brain. For instance, presence of germs in the air, sound of earth's movement, signals received by brain are not observed by five senses. But experiment indicates their presence. It was this experiment that led man to invent tools to search new objects. These tools enhance human capacity to observe and perceive. One of the examples are the tools invented to observe tiny objects or remote objects which otherwise could not be observed by human eye. Similarly, sound and sights were transferred to remote areas through mobile phone, radio and T.V.

The scientists conduct experiments to understand and observe various universal phenomenon. Let us analyze their methodology.

Whatever you have to ask, ask this child. Your Lord will show a sign of His Greatness to ease the surprise and satisfy them."

Mary (PBUH) felt content after listening to the message from God and walked towards Jerusalem, baby in arms. People surrounded her when they saw her and said,

"O Mary! Thou hast come with an amazing thing. Oh, sister of Aaron! Thy father was not a wicked man nor was thy mother a harlot."

But following the command of God, she pointed towards the baby, signalling that they could ask him whatever they wanted as she was fasting.

They said, "How can we ask an infant who is yet in his mother's arms?" However, upon hearing this, the baby Jesus (PBUH) spoke up,

"I am the servant of God. He has given me the Book and made me a Prophet. He has made me blessed wherever I may be, and He has enjoined on me prayer and charity as long as I live. He has made me dutiful to my mother and has not made me insolent, and arrogant. So, peace be upon me, on the day I was born, the day I will die, and on the day, I will be raised again alive."

(Episode 2)

Khwaja Hafiz was from Shiraz, hence he is known as Hafiz Shirazi. He was an excellent Persian poet and one of his couplets is as follows:

"I would gift Samarqand and Bukhara, both cities just for a black mole on the face of my beloved in Shiraz who has captivated my heart."

It is said that when King Taimur heard this couplet, he summoned Hafiz Shirazi to his court. When he arrived, the king said, "Samarqand and Bukhara are my home towns and I am naturally attached to both of them. You have announced to gift both cities just for a black mole of your beloved's face."

He replied, "Shiraz is my home town. Shiraz in this couplet refers to the entity from whom everything originated. The black mole of the lover refers to *Tajalli* (one of the highest stages of Divine light). Samarqand refers to this world, and Bukhara is the hereafter. You desire this world and forsake it for the sake of the hereafter. However, I forsake both, this world and the hereafter, as I only desire God."

King Taimur was impressed by this explanation and said, "O' Sheikh! Salute and respect for your sense of love."

Israel." (Quran, 3:45-49)

"And make mention of Mary in the Scripture, when she had withdrawn from her people to a chamber looking East, And had chosen seclusion from them. Then We sent unto her Our spirit and it assumed for her the likeness of a perfect man. She said: Lo! I seek refuge in the Beneficent One from thee, if thou art God fearing. He said: I am only a messenger of thy Lord, that I may bestow on thee a faultless son. She said: How can I have a son when no mortal hath touched me, neither have I been unchaste! He said: So (it will be). Thy Lord saith: It is easy for Me. And (it will be) that We may make of him a revelation for mankind and a mercy from Us, and it is a thing ordained." (Quran, 19:16-21)

As a human being, it was natural for the revered Mary (PBUH) to be anxious. These feelings grew to a peak when she saw that her child was due to be delivered.

She thought it appropriate to go somewhere else as if the birth took place around people she knew, it would bring her a bad reputation as they did not know nor would believe the truth.

Therefore, she went to Mount Seir about 9km away from Jerusalem, which is now known as Bethlehem. After several days, she started feeling contractions. Due to the pain and feelings of restlessness, she sat down with her back supported by the trunk of a palm tree. Speculating on how the future would look for her after this, she grievingly said, "I wish I had died long before and that people had forgotten my existence."

Mary, Do not be Sad

At that moment, an angel called from the south of the oasis:

"Then cried unto her, saying: Grieve not! Thy Lord hath placed a rivulet beneath thee, And shake the trunk of the palm tree toward thee, thou wilt cause ripe dates to fall upon thee. So eat and drink and be consoled. And if thou meetest any mortal, say: Lo! I have vowed a fast unto the Beneficent, and may not speak this day to any mortal." (Quran, 19:24-26)

She was scared from her experiences, feeling lonely and in pain. However, those feelings subsided after the kind words of the angel. Though, she was still worried that although her relatives and people believed in her righteousness and chastity, they would not believe that the child was born without a father.

God sent a message again through an angel to revered Mary (PBUH):

"When you go back to your people and when they ask about this matter, do not reply. Tell them instead through signs that I have vowed a fast, so I shall not be able to speak to any man today.

Prophet Jesus (PBUH)

As a human being, it was natural for the revered Mary (PBUH) to be anxious. These feelings grew to a peak when she saw that her child was due to be delivered.

Angel of God

The pious, righteous and respectable Mary (PBUH) remained busy in prayers in her chamber. She would not leave her room unless it was absolutely necessary. Once, for some reason she had left her chamber and sat in seclusion at the eastern part of Al-Aqsa mosque.

All of a sudden, an angel appeared in the guise of a human. When the honourable Mary (PBUH) saw a stranger, she became nervous and said,

"Lo! I seek refuge in the Beneficent One from thee, if thou art God fearing."

The angel replied, "Don't be afraid. I am only a messenger of thy Lord, that I may bestow on thee a faultless son."

Mary (PBUH) was astonished by the message, and asked, "How can I have a son when no mortal hath touched me? Neither have I married nor have I been unchaste!"

The angel replied, "Thy Lord says: It is easy for Me. And it will be that We may make of him a revelation for mankind and a mercy from Us, and it is a thing ordained.

O Mary! God giveth thee glad tidings of a word from Him, whose name is the Messiah, Jesus, son of Mary, illustrious in the world and the Hereafter, and one of those brought near unto God. He will speak unto mankind in his cradle and in his manhood, and he is of the righteous.

So it will be. God createth what He will. if He decreeth a thing, He saith unto it only: Be! and it is. And He will teach him the Scripture and wisdom, and the Torah and the Gospel. And will make him a messenger unto the children of Israel."

The Quran mentions these events with the following:

"When the angels said: O Mary! God giveth thee glad tidings of a word from Him, whose name is the Messiah, Jesus, son of Mary, illustrious in the world and the Hereafter, and one of those brought near (unto God). He will speak unto mankind in his cradle and in his manhood, and he is of the righteous. She said: My Lord! How can I have a child when no mortal hath touched me? He said: So (it will be). God createth what He will. if He decreeth a thing, He saith unto it only: Be! and it is. And He will teach him the Scripture and wisdom, and the Torah and the Gospel. And will make him a messenger unto the children of

horse and said, "Moonflower, this is the horse that brought you here, and this is the horse that shall carry you home. He has been waiting for you."

Moonflower beamed, and so did her mother and father. Although they were down, they knew their daughter would be happy with the man of her choice on the moon.

Suddenly, the deep voice of the moon spoke after 18 years of silence. "You both have used the years with my daughter very wisely, and as a reward, I will not take Moonflower away from you forever. Each year on her birthday, she will come to you for a visit, and will bring her husband and her children along with her."

Everyone was overjoyed upon hearing this, and the celebrations continued till dawn.

As the night faded, the farmer, his wife and their children hugged Moonflower and wept as they watched her mount her horse and ride up the moonbeam.

But forever since that day, on her birthday, Moonflower comes back to Earth for a visit, to celebrate and to honour all generations that came before her and those who will come after her.

Moral of the story:

"And know that your possessions and your children are a test, and that with God is immense reward." (Quran, 8:28)

This story teaches us about the true essence of parenting. God hands us children to look after as our own for a finite period, and we must use those offered years wisely. This means teaching and displaying the values that a child will grow to adulthood with.

In this story, the parents chose to raise their child with kindness, compassion, love and wisdom, and hence Moonflower grew with the qualities that were invested in her.

This story also shows that duty of a child towards their parents in fulfilling their desires and needs. Moonflower realised how much her absence would hurt her parents and worked towards bringing them happiness.

"And We have commended unto man kindness toward parents. His mother beareth him with reluctance, and bringeth him forth with reluctance, and the bearing of him and the weaning of him is thirty months, till, when he attaineth full strength and reacheth forty years, he saith: My Lord! Arouse me that I may give thanks for the favour wherewith Thou hast favoured me and my parents, and that I may do right acceptable unto Thee. And be gracious unto me in the matter of my seed. Lo! I have turned unto Thee repentant, and lo! I am of those who surrender (unto Thee)." (Quran, 46:15)

it to fix their farm and buy more horses, helping them prosper in business. They were very happy and adored their dearest daughter Moonflower and showered her with a great amount of love and kindness. The years flew by them and their stables grew larger too. People purchased horses from them, as they were renowned as the finest in the land. As their wealth grew, so too did their generosity. Moonflower grew to be kind, generous, wise and loving to match the values her parents had raised her with. Everyone treated her with great respect for coming down to earth.

However, the farmer and his wife did not forget that Moonflower would one day leave them, and she too was worried about the day she would have to say goodbye to them. Moonflower was very happy on Earth, and she loved her parents very much.

One day, she overheard her parents talking to each other. "When Moonflower is gone, our hearts will be broken and our forefathers will be upset that they will have no descendants on Earth to remember them."

Moonflower decided that she would find a way to somehow have siblings, and so went to see the mayor. She told him how her parents were the best anyone could ever wish for and asked that he let them adopt some children. The mayor could not disagree as he had witnessed how they had raised Moonflower with great values and love, and how they were financially stable now too. He had no excuse to deny them more children through adoption.

The farmer and his wife were overjoyed to hear what Moonflower had done for them. Over the next few years, they adopted three boys and two girls and all of them were raised with the same generosity, kindness and love they had always shown Moonflower. Then finally, the day arrived when Moonflower turned 18.

Her parents were sad but they still invited the entire village to celebrate her birthday. They filled the garden with colourful lanterns, invited musicians to play her favourite songs and filled the tables with her favourite dishes. Everyone sang and danced through the evening and just as it was foretold, at the stroke of midnight, a bright moonbeam suddenly shone into the garden, settling on a flowering cherry tree.

Everyone stared awestruck as they watched dignitaries floating down the moonbeam on magnificent horses. The women amongst them were beautifully dressed in embroidered kimonos and the men were dressed as warriors. When they reached the surface, they joined the party and enjoyed the evening. Moonflower noticed a young man amongst them all who she thought was very handsome. She smiled at him and he smiled back. He led her to his

The Borrowed Child

Everyone stared awestruck as they watched dignitaries floating down the moonbeam on magnificent horses...

Once upon a time, there was a horse farmer and his wife, who wanted to adopt and raise a child as they had no children of their own. They were very poor but had hearts filled with love and great traditional values to offer to a child. They decided to approach the mayor of their town who refused them outright due to their financial instability, stating that it was no environment to raise a child in. Terribly saddened, they returned home and as time passed, their sorrow grew deeper. Often, they would sit around and talk of how they wished to raise a child with the values of their ancestors.

One night during the season of spring, they noticed that the moon was shining brighter than usual. The moon's rays seemed to focus into a beam that shone through the window of their little cottage, and on to their dinner table.

A very small dot began to appear and the couple watched in astonishment. The dot grew until it turned into a silver horse, but the size of a mouse. On the back of the horse was a flowering cherry tree branch.

The couple started at the horse and the branch on its back in amazement, and suddenly, a deep voice filled the entire room. "Do not be sad," it said. "I am the moon, and I am sending you one of my children so that you can raise her as your own."

With those words, the cherry blossom on the branch flowered completely and within its petals was a tiny baby, as small as the tip of a finger. The voice spoke again, "This is Moonflower. She will be yours to love and raise up until she turns 18 years of age. On her 18th birthday she will return to me. Now gently lift the baby up and take good care of her."

The couple reached out and lifted the tiny baby and placed her on a mat, and as they did so, Moonflower began to grow. In no time at all, she was the size of a human baby. Her eyes shone as bright as the stars and she was dressed in a bright pink kimono, embroidered with cherry blossoms. They found a magnificent ruby clasped in the child's hands.

The tiny horse turned its back on the couple, rode up the moonbeam and disappeared. Before parting, the moon said to them, "Use your years with my child wisely." With those words, the beam from the moon's rays disappeared too.

The couple sold the ruby for a good amount of money and used

V

Memory has been a conundrum that scientists have been trying to solve for years as they are fully aware of how significant a role it has in the learning process of human beings. They also know that in the race of life, successful individuals learn easily, and in this learning process, memory has a fundamental role. This is why scientists are in pursuit of the fundamental centre of memory.

An experiment was conducted by Karl Lashley in 1920. Lashley trained rats to look for food in a maze. He then made several injuries in different parts of their brains to know which part of the brain affected memory.

To his amazement, he found that no injury impaired the rats' memory. It was then established that there is no specific space in our brain reserve for memory, rather, memory encompasses the entire brain.

Nevertheless, as a result of continued efforts, scientists invented fMRI. An fMRI scan can show images of the brain but with various levels of brightness depending on where increased activity is taking place.

A study was carried out in which 15 healthy subjects were given a questionnaire containing 160 easy questions while being scanned by fMRI. The result of the experiment is as below:

The primary functions of the temporal lobe are to process sensory information and derive it into meaningful memories, language, and emotions. The shades of memories older than 12 years are stored in various parts of the brain, especially the frontal and parietal lobe, and are stored in various parts of the temporal lobe. This phenomenon strengthens the idea that there are various slots formed within the brain in accordance to the time the memory was recorded.

However, scientists have not yet been able to come up with a method to find out which part of our brain contains certain information, and in which form it is stored in our memory. That is because they only focus on and search for the material part of the brain, and consider it the epicentre of our memory. Whereas, in reality, apart from the material presence of the brain, our mind retains its own existence and identity – but scientists do not have any reliable research to ascertain its processing.

The mind, on one hand is connected to our brain, and on the other hand, it is also connected with the sub-consciousness, where all recorded memories and their tiny details are present.

In order to understand it, we will have to learn about the information stored in the sub-consciousness.

Renowned Sufi Master, Huzoor Qalandar Baba Auliya (RA) writes in his seminal book, 'Qudrat Ki Space',

"*Shaoor* (consciousness) always emerges from *La-Shaoo*r (sub-consciousness). The feelings of *La-Shaoor* are shifted to *Shaoor*, but their strength is considerably reduced; whereas, when the feelings are returned from *Shaoor* to the *La-Shaoor*, they are stored in our memory, and are called *Taht-al-Shaoo*r."

Long Term Memory

This is identical to a computer's hard drive . Information that has a deep effect on us is encoded permanently in our long-term memory cells. According to a conscientious estimate, our mind is capable of storing five times more information than an encyclopedia. This portion is in actuality, our memory.

Exactly as a hard drive of a computer is comprised of partitions, our memory has several built-in slots too. Each slot functions discretely for specific sets of records and purpose. For instance, there is a slot for conversation, and others for language or dialect, technical information, and arithmetical facts and figures, etc.

In the book '*Rang o Roshni se Ilaaj*' written on the subject of how to cure ailments and afflictions through colour therapy, the Spiritual Master, Khwaja Shams al-Din Azeemi writes,

"There are billions of cells in our brain through which electrical current flows. Through this electrical current, our thoughts pass through *Shaoor* and *Taht-al-Shaoor*, but more in *La-Shaoor*."

There is a storage space in our brain in which electrical current constantly takes images and distributes them. This image is either very dark, or extremely bright.

There is another space where important information resides, but they are not so important that we may recall them even after years.

The third storage space absorbs far more important information, that recalls incidentally, on an as-needed basis.

The fourth storage space is for routine matters that helps us carry out daily chores, but one's intentions are not involved in it.

The fifth space is where stray thoughts comes to our mind with no significant value to the affairs of our lives – these are followed by more stray thoughts that are irrelevant to the preceding ones.

The sixth space has information that either never occurs to us, or if it does, it immediately manifests itself. For instance, if the thought of a bird comes to the mind, it instantly appears before us.

There is another storage space, the seventh one. This is known as memory.

nently stores records within it, and has nothing to do with whether the system is on or off. Just like the cassette and computer, human memory also has three types:

1. Sensory Memory
2. Short Term Memory
3. Long Term Memory

Sensory Memory

This is a fast-stored record of information by our five senses, but it is not necessary that we would have paid attention on the contents of the information.

For example, if we are travelling to work from home, we will see many people passing by on our way and hear many voices too, but upon reaching our destination, if someone were to ask us what we saw on the way, we would not be able to come up with a proper answer. Rather, we will say that we did not pay attention to our surroundings.

Nonetheless, every incident, scene, and all voices we come across while traveling, were stored in this sensory centre temporarily, but because of the lack of attention given towards them, these inscriptions fade away. This memory is known as Sensory Memory, which is there to sustain a continuity in our conscious senses.

This is the process through which a sequence is maintained in our consciousness (wakefulness), and it maintains the order of life, as in the sequential, numerical order – one-two-three.

On the other hand, whilst asleep, when our conscious mind becomes dormant and our subconscious mind takes over, the series of events and incidents that take place in our dreams are directly stored into our memory. For that reason, it is not possible to maintain the sequence in the stored information. As soon as we wake up, our Sensory Memory begins processing again, exactly from where it left off.

This phenomenon enables us to keep balance and coordination in our conscious life or material senses, which helps us maintain chronological sequences. If this memory stops functioning, we lose track of our sequence in time and space.

The base of this memory is also the centre of our five senses, but the scientists of today are not yet aware of the actual centre of this memory. Hence, the most important process of our daily lives is still deprived of due attention from modern science.

Short Term Memory

This memory works within us like the RAM of a computer. Whenever and whatever we pay attention to in our daily life, is stored as information temporarily in our short-term memory for about 15 to 20 seconds. If the information is repeated, or somehow its effect grows stronger, the information transfers to the long-term memory slot.

on it as we progress further in our lives. It is an integral and a fundamental factor which causes some to face failure in life, and others to wear the crown of success.

We identify ourselves only because of our memory. We recognise our parents, friends, and even run our affairs efficaciously with its help. Be it beautiful memories or bitter moments, we proudly introduce them as our experiences. If the memory slot did not exist in our brains, we would not remember to even eat or drink; none of our relations would be of any use to us, we would be unable to work or carry out our business, and would be unable to receive any education.

The brain, among all of the body's organs, is the only organ that memorises and keeps a record of the series of events that influences the body, and utilises memory when needed. No other organ has this capability. However, a type of white blood cell in our blood, an important part of our immune system, has the ability to store information about germs and viruses, and to take defensive action against them. But our mind's ability to remember things, is a higher order of memory, and far better organised and systemised than these cells.

- How many types of human memories are there?
- How does memory function?
- Where are the memory centres located in our brain?

Let us understand these questions by examples of a computer and a tape recorder.

Most of us will have used or seen a tape recorder before. A tape recorder has different buttons with distinct functions to carry out, and contains a cassette, microphone, and speakers. Among these buttons, one button is 'play' that plays the recording on the cassette; another button is 'record' that records voice on to cassette when pressed. There are buttons to 'rewind' and 'forward' the already recorded voice.

The basic system of our memory functions in the same manner. We store a certain incident in our memory through our eyes, ears, skin, tongue, or nose, which is recalled when needed. The function to rewind and forward in a tape recorder is similar in humans.

Now let us analyse memory through the example of a computer. A computer has a type of memory called RAM, which stands for Random Access Memory. There is a Hard drive along with CD, DVD, and USB memory too. Random-Access Memory works from the moment the computer system is powered on, and it stores files that are in use while the computer is processing. The RAM stops working when the computer is shut down, whereas the Hard Drive perma-

Physical Record of the Mind

Scientists have not yet been able to come up with a method to find out which part of our brain contains certain information, and in which form it is stored in our memory. That is because they only focus on and search for the material part of the brain...

"Munir has had an accident!"

The news came as a great shock to Munir's parents. They both rushed to the hospital where they were told by the doctors that their son was in a coma and in critical condition, having sustained brain injuries. They also said that his life or death depended on the next 24 to 72 hours. Distraught, the parents, siblings and relatives all began to pray for his health as they waited. Owing to the prayers of his family and his good fortune, after 15 days, Munir regained consciousness and was shifted to the general ward.

The first conversation Munir had with his parents was about the accident, where they asked, "Tell us son, how did it happen?"

Instead of answering, Munir looked at them in surprise, and disturbed them with his reply, "Did I have an accident?"

His mother cried assuming that he had lost his memory. The doctors explained that the accident had affected his memory to a certain extent and that he did not remember any details of the event, however, his pre-accident memory was still intact.

Akram Sahib, who worked like a young man despite being in his 70s, was suddenly afflicted with paralysis and was admitted to the hospital. After sometime there, he recovered mostly and returned home, but his family members noted that he had forgotten their names and developed a tendency to confuse the names of objects and articles.

According to the doctors, the part of his brain that controls memory was affected due to paralysis, and as his paralysis continued to improve, he would return to a normal, healthy life.

Now, imagine if you one day woke up in the morning to find a relative who refused to recognise you and the rest of the family, and even the details of their life you had shared with them? How would you feel then? How would they feel, not being able to remember? What would your family go through? Even the thought of it is frightening, so much so that it really makes you appreciate the crucial role that memory has in our lives.

In all aspects of life, memory plays a fundamental role in who we are today, as we utilise it daily. It is such a priceless boon from God Almighty that we cling on to it to achieve success, and depend

recorded from the other individual. They achieved the same result no matter how far the subjects were distanced from each other.

I began to see all of us creatures as drops of rain that were falling down upon the sea. Each drop makes a ripple as it touches the surface of the sea. These drops ripple outwards to entangle into the ripples made by the other drops and eventually it becomes difficult to differentiate between the individual ripples. The consequences of every individual action in this universe is never limited to it alone, in fact, it affects everything it is even remotely associated with, even if separated by great distances.

We are all like the entangled photons separated from the one unified point of origin. The same Divine light runs through all of us. God Almighty has ordained in the Holy Quran,

"O mankind! Be careful of your duty to your Lord Who created you from a single soul and from it created its mate and from them twain hath spread abroad a multitude of men and women."

(Quran, 4:1)

"He it is who did create you from a single soul, and therefrom did make his mate that he might take rest in her." (Quran, 7:189)

Since it is testified that we are the origin of one soul, why then are we remaining in oblivion, thinking our individual actions affect the entire universe? Why does the 'I' think that its existence is the most supreme. Why don't we realise that as a matrix, when one part of the energy matrix collapses, the whole matrix collapses. Our good, ripples as good in the lives of those we interact with. Our bad intentions, thoughts, words and actions ripple as bad in the lives of all around us. Visualise a smoker who forcibly makes all those around them a passive smoker, even if they want to remain healthy. Such is the case of a person who is gripped by negativity; they force their negativity into the space of everything and everyone around them.

We are all inseparable from one another. Should we, mankind, not realise our social responsibility towards each other and live in peace and harmony?

The best way to live, in my opinion, is as Maulana Rumi (RA) has stated,

"Wherever you stand, be the soul of that place."

The sons of Adam are limbs of each other, having been created of one essence. When the calamity of time affects one limb, the other limbs cannot remain at rest. If you have no sympathy for the troubles of others, you are unworthy to be called by the name of a human.

— Sheikh Saadi

So why not understand quantum entanglement through the common medium in the creation of all creatures i.e. light? Imagine sunlight shining through a beam. As per quantum physics, this light is made up of tiny packets of light, which are called photons. You could say photons are basic units of light. They are always in motion and travel at the speed of light within a vacuum.

When one fires a laser beam through an energetic photon, it splits into a pair of twin entangled photons. This phenomenon is called quantum entanglement. At this point, something strange takes place. The two quantum particles interact in such a way that are profoundly linked, and begin to 'share' a common existence. In other words, we can say that what happens to one particle will directly and instantaneously affect the other particle, even if it is many lightyears away.

Dr. Nicolas Gisin and his colleagues from the University of Geneva conducted a twin-photon experiment. They sent pairs of photons along optical fibers similar to those used for transmitting telephone calls, but, they were sent in opposite directions to villages that were in the north and south of Geneva.

When the photons reached the end of these fibers, they were both forced to make choices of pathways. As the photons were not in physical communication with each other, one would assume that their individual choices had no relationship to each other. However, when the results were compared, the independent decisions of the paired photons matched every time.

In the year of 1998, the department of defense in the United States of America conducted an experiment. Scientists scraped palate cells from a volunteer and placed it in a test tube, connecting it to a polygraph machine. The volunteer was also connected to one, but in a different place within the building. They kept the television playing peaceful, violent and exciting programs at regular intervals before both test subjects. They recorded that the scraped individual cells recorded the same activity at the same moment as the volunteer. For example, when the volunteer was calm, the scraped cells were also calm and so forth.

In the Einstein-Podolsky-Rosen experiment, they used two individuals who were complete strangers. The individuals were given time to know each other superficially and were then separated by fifteen metres in an electromagnetic cage, connected to an EEG machine so that their neurological activity could be tracked.

This cage was designed such that no signals could enter or leave it. They pointed a flashlight into the eyes of one of the individuals and the person showed neurological activity and a constriction of pupils. At the very same instant, the same result was

understand the simple concept of Oneness, and how we are all made from the same *Noor* (a stage of Divine light).

Were there any particles other than light that were common in all the creatures of the universe? A particle that would prove the concept of oneness through scientific findings? As these thoughts whirled in my mind, I stood on the balcony and leaned against the strong pillar that supported the structure of the building. I looked at the column and began to imagine the beams of iron rods within the sheaths of cement and paint, and the power of iron caught my attention. The Iron Age had revolutionised our standards of living. But wasn't this very iron strengthening my body by running through my blood? A drop in iron levels in my blood would make me weak and anemic.

Researching further, I stumbled upon scientific details on the origin of iron. Iron is incidentally a product of an extremely fierce process called the supernova explosion. Stars turn all of their helium into carbon and oxygen atoms. These atoms then turn into iron atoms, which are very heavy.

When most of the star's atoms turn into iron atoms, the star becomes a supernova. When these supernovae explode, gravity takes over and creates planets such as Earth through them. In other words, the iron that is in this planet earth and in the body of humans is the same stardust.

Is it not intriguing that we are indeed a micro cosmos created out of the macro cosmos? Is this not proof that everything in this universe is made up of the same particles? We have a star within us as much as a star has us within it?

Life can be seen through two views. The first view is that every individual exists independently and that this universe is a collection of individuals. The second is that every individual exists linked to other beings in the universe, and that we are a matrix of energy – a connection that is inseparable.

We could elaborate this with an example of fingers and the palm. Each finger is an individual and different from the other but they are connected to the same base, which we can say in this case is the palm. German writer Johann Wolfgang von Goethe says, "Nature has neither core nor skin; she is both at once outside and in." Only when we heal the estrangement between people and the planet will peace prevail.

As I began to look for more scientific evidence that we are all interconnected, the theory of quantum entanglement came forth. Quantum physics defines that those particles that are entangled remain connected in such a way that the actions performed by one particle affects the other, even when separated by great distances. Albert Einstein referred to this as "The spooky action at a distance."

Oneness

Our good, ripples as good in the lives of those we interact with. Our bad intentions, thoughts, words and actions ripple as bad in the lives of all around us.

The windows of our room were long and in the direction of the sunrise. However, there was one hitch to it. In the wee hours of the morning, sunlight fell upon every face that slept in that room and woke us up. The sheer curtains were too thin to prevent the flood of light. The thicker curtains that were brought in next also failed – the sun was unstoppable as it peered into the room as a hue.

As a final attempt to beat the sunbeams, double blinds were installed. However, no matter what was done, the room would never be completely dark. A tiny ray of light always seemed to find its way into the room and lit it up. As the brightness diminished, our eyes became accustomed to seeing in lower intensities of light and could identify the objects that lay around in the room. Flabbergasted, I sat staring at the power of light and sight.

As the above events unfolded, a thought came to mind that made me smile. Creating darkness took effort, while basking in the light was effortless. Was mankind not doing the same to their own lives? Were they not drawing curtains upon curtains to darken the light within their own souls? And yet, despite all their efforts at pushing themselves into the depths of gloom, the light within them always found a way to shine through their states of despair and put them back on track. Moreover, they were blessed with a sight that could penetrate all layers of darkness.

As I witnessed the power of light and sight, verses from the Holy Quran played in my mind, unravelling their secrets to me.

"God is the Light of the heavens and the earth." (Quran, 24:35)

"Vision comprehendeth Him not, but He comprehendeth (all) vision. He is the Subtile, the Aware." (Quran, 6:103)

From this we can see that both Light and Sight is He – God, the Almighty.

"What is the problem with mankind?" I wondered out loud. It dawned upon me that the problem in the universe was the ignorance of 'I'. The 'I' in every person wrapped in veils of unawareness seemed to be in a constant battle with themselves and everyone around. And what was the battle all about? The 'I' within each of us was trying to be the centre of not just our own personal universe, but also every other universe around us.

It is a very long time since the days of cavemen and yet the 'I' has not lost the ideology of 'Survival of the fittest.' It did not

For a long time, he preached with sincerity and devotion, and eventually people realised that their rituals were nothing but a means to go astray. His number of followers continued to increase, and he eventually was known as Peer Baba (RA).

After a while, Syed Ali (RA) desired to see his own town and parents. He reached Kunduz and found out that his father had passed away. His mother was alive and was waiting for his arrival. When she found out that he had gotten married and had children, she instructed him to go back to live with his family, and to continue to guide people.

On his return, Peer Baba (RA) decided to live permanently at Pachakalay near Buner. There was a cave near Pachakalay that he liked very much where he kept himself busy in prayers. During this time, he did not forsake his duty which was assigned to him by his spiritual master. It is a law that wherever a friend of God settles down, will become a lively town.

Peer Baba (RA) said, "Without a wise spiritual master, a person can lose track even if they pray devotedly and perform spiritual exercises in solitude. The master makes sure that the disciple stays on the course of the most honourable in the universe, Prophet Muhammad (PBUH)."

One day, Peer Baba (RA) said, "In the path of spirituality, a disciple passes through three stages. The first stage is of fame, when crowds of people gather around the individual. The second stage is when wonderworking occurs, and a third is when they wish for nothing except pleasing God; this is when one becomes *rasikh fil-ilm* (firmly established in knowledge)."

Syed Ali Ghawas Tirmizi (RA), known as Peer Baba (RA) is buried in Buner. There is a beautiful shrine with a mosque adjacent to it. The cave where he used to meditate and perform spiritual exercises is located nearby. He passed away in 991 Hijri (1583 CE). People from all walks of life visit his shrine.

The following poetry is written by his follower, Muhammad Shafi Sabir, as a token of respect:

A living sign of guidance is Peer Baba, a secret keeper of spirituality is Peer Baba.

A shelter of love, a haven of affection, a pride of heaven is Peer Baba.

Where autumn does not find any path, such an autumn less garden is Peer Baba.

Every heart is enlightened through his love, such a bright torch is Peer Baba.

Everyone is coming to offer greetings, to the noble court of Peer Baba.

Where even emperors bow with respect , such is the abode of Peer Baba.

V

is straight and is the path of Truth."

When leaving, his father tried to give him gold coins and he initially refused to take them, "It is of no use to me." However, thinking that his refusal may hurt his father's feelings, he later accepted it. He distributed the coins among the needy.

When his father left, sadness took over him, and the desire to see his spiritual master grew stronger. Before leaving for Peshawar, he went to Ajmer. Since he was accustomed to living alone, it was in his mind that he would seek permission from his master to relieve him from his duties of guiding people, as the crowds of people were burdening him. However, when he reached Ajmer he learned that his master, Hazrat Salar Ata Allah Rumi (RA) had passed away. He languished as he heard the news as he so dearly wanted to see him.

He reached his master's house. His son, Sheikh Hussain was meditating. After meditation, Sheikh Hussain said, "Syed Ali, during meditation I saw my father who said, 'I have left two *Khirkay* (ceremonial dresses used as a symbol of blessing and often represent transfer of knowledge and authority). Distribute one among the ordinary followers, and the other to the person who will come here after a long journey. That person is on the right path and God has blessed him with the ability to teach and guide.' As per the qualities mentioned by father, the second *Khirqa* is yours."

Syed Ali Ghawas Tirmizi (RA) understood the concealed message. He accepted the *khirqa*, and left Ajmer for Peshawar, staying for a brief moment in the places in between.

His desired destination was Swat and the areas around it, for they were in a great, unethical mess. Mugging and robbery were part of the daily norm, and the areas were marred with ignorance and uncivility. Killing one another was also quite normal there. There were breweries everywhere and people commonly consumed alcohol. People were divided into tribes, and each tribe had an enmity with the other tribe.

In such circumstances, it was very difficult to deliver the message of God. However, the friends of God reach people through love, and love can transform a rock into beeswax.

What does it mean to drop droplets of water on a stone? There is a water within the rocks. The droplet of water keeps knocking on it without thinking of the consequences, and waits for the day to see an opening in the rock so that it may find a passage and unite with the water already present in the rock.

The message of truth reached everyone in town through the resilient efforts of Syed Ali (RA).

"The One Who blesses does not distribute His knowledge to anyone other than those who are deserving of it."

Tasawwuf (spirituality) is all about serving the creations of God. Those who are blessed with knowledge and intelligence, can thank God by spreading their light among the people who deserve it, irrespective of their religion, nationality, caste, colour or race.

Syed Ali Tirmizi (RA) had no other option but to follow the orders. He started meeting people and a great number of devotees began to gather.

About 500 years ago, the people of Buner, Swat and adjacent areas practised old traditions and beliefs. Their lives in the wilderness of mountains and jungles were similar to animals.

During this, a man who was thousands of miles away from them received a message from God to guide them, as they were in need of a guide. The wise man who received this message was Sheikh Salar Rumi (RA). He, according to the Will of God, sent his most wise student, Syed Tirmizi (RA), to educate and serve those people.

During his travel, Syed Ali Ghawas Tirmizi (RA) reached Pind Dadan, a city near Gujrat, Punjab. It is located on the bank of the river Jhelum. Before his arrival, a young individual named Kailash saw a dream. He saw that a holy person had come to the village, and that the whole village felt his noble presence. He narrated the dream to everyone and also described the appearance of the revered man from his dream.

As soon as Syed Ali Ghawas Tirmizi (RA) reached Pind Dadan, Kailash exclaimed with joy and told everyone that the man from his dream had arrived. The people gathered around Syed Ali Tirmizi (RA) and said, "You are our guide." Syed Ali Tirmizi (RA) accepted them as his students and stayed there for some time to educate them.

The people turned towards religion and started visiting him to acquire knowledge. As the number of people increased with every passing day, Syed Ali (RA) felt that it was hindering his personal routine of prayers and spiritual exercises. He thought of going to his spiritual master in Ajmer to request that he be allowed to live in solitude.

This was going on during the time when Sher Shah Suri defeated the Mughal emperor Humayun. Humayun left for Iran via Sindh and Baluchistan, and the remaining army left for their countries. Syed Ali Tirmizi's (RA) father, Syed Qambar Ali, was among them as well.

On his return, he crossed Pind Dadan and met his son. He hugged him dearly and said, "We remained entangled in the affairs of the world where there are highs and lows, but you did the right thing. You adopted a path which

Saylonah (RA) who lived there. When he went to meet the sheikh, the master met him kindly and allowed him to stay there.

Syed Tirmizi (RA) was very impressed with the Sheikh Saylonah's (RA) knowledge, such that one of his sayings engraved into his heart, "An enlightened person never forgets to remember God at all circumstances when they reach the status of *Fana fil-Allah* (completely immersed in the attributes of God)."

One day, Sheikh Saylonah (RA) was delivering a lecture and Syed Tirmizi (RA) had a thought, "Is he still thinking about God even now?" Sheikh Saylonah (RA) paused in his lecture and said, "Syed Ali! A servant of God is the only individual who is always immersed in the praise of God." Syed Tirmizi (RA) felt ashamed for his ignorance.

After staying for quite a long time with Sheikh Saylonah (RA), Syed Tirmizi (RA) had a strong desire to become aware of the secrets of spirituality. So, he discussed it with Sheikh Saylonah (RA) who told him, "Son! This is not an easy task; it requires help from a master. It is already destined who will be blessed and where from. Take my letter and go to Ajmer Shareef. There you will find Hazrat Salar Rumi (RA) who has been designated to bless you with knowledge."

Syed Ali Tirmizi (RA) offered gratitude to Sheikh Saylonah (RA), sought his permission to leave, and then took the letter to leave for Ajmer, and after a long journey, he reached his destination. He visited Sheikh Salar Rumi (RA) and presented the letter. After reading the letter and asking about his wellbeing, Sheikh Salar (RA) said, "O' Syed! You can achieve your objective through service and for that you will have to stay here."

Syed Ali Tirmizi (RA) was given the duty to carry the prayer mat of his sheikh. He fulfilled his responsibilities diligently and seeing this devotion, the Sheikh Salar Rumi (RA) began to give him spiritual lessons. He practiced them efficiently, and would seek assistance from his master based on what he experienced during the spiritual exercises. Being satisfied with the progress, Sheikh Salar Rumi (RA) would move him on to the next lessons. This continued for a while and eventually, Syed Ali Tirmizi (RA) was blessed with rewards of the unseen world. After this, Sheikh Salar Rumi (RA) blessed him and appointed him as his successor.

Sheikh Salar Rumi (RA) blessed Syed Ali Tirmizi (RA) and allowed him to guide people, but having lived in isolation for so long, he found it very uncomfortable to meet people.

He explained his problem to his master, "I do not find the courage to speak and guide people." Sheikh Salar Rumi (RA) replied,

Syed Qambar Ali tried his best to engage his son in these affairs, but nothing worked. Sometimes, he would take him to the royal court in royal attire, making him experience many activities, but the superficiality of it all could not impress Syed Ali Ghawas Tirmizi (RA), and attending royal gatherings made no difference to his heart. Rather, he felt a lot better in the company of intellectuals.

Sultan Zaheer al-Din Babur planned to attack Hindustan and many men gathered to fight on his call. Babur sent his son, Naseer al -Din Humayun to Kunduz to invite people to join the force. As Syed Qambar Ali held an important designation in the royal court, he joined the army along with his son.

In the battle of Panipat, the army of Zaheer al-Din Babur defeated the opponents and established their might in Delhi as conquerors. Syed Ali Ghawas Tirmizi (RA) says, "The idea that the world is transitory and instable grew stronger in my heart when I saw a kingdom transfer from one hand to another."

One day, Syed Ali Ghawas Tirmizi (RA) visited the shrine of Sheikh Sharaf al-Din Bu Ali Qalandar (RA). At that time, he was clad in his army uniform. He sat down for meditation and the blessings of Sheikh Bu Ali Shah Qalandar (RA) began to shower on his heart. That experience changed his feelings about life so much so, that he decided to live in seclusion from then on. A guard waited for him outside the shrine, but Syed Ali Tirmizi (RA) took a different exit and left for an unknown place.

His father and friends tried their best to locate him, but could not find any trace of him. His friends gave up, but his father, restless and worried, continued to look for him. Eventually, he found his son sitting in a solitary state, uninterested in the world and completely attentive to the Creator of the universe. When Syed Ali Tirmizi (RA) saw his father, he touched his feet and said, "Please leave me in this state, I am in safe hands."

After losing hope of convincing his son, Syed Qambar Ali offered money so that his son may use it in travel, but it was refused. "Dear father," he said. "As I am travelling for the Truth, I will seek my provisions from God. Why would I have left the royal court had I been seeking wealth?"

Syed Ali Ghawas Tirmizi (RA) reached Manakpur, a place near Allahabad. He ended up there after many stopovers at other destinations. The paths themselves guide those who search for the Truth whole heartedly at God's Will. God takes them to a place where they can formally start their spiritual education by taking them through the highs and lows of life.

When he reached there, somebody told him to visit a well-known holy person called Sheikh

A Secret Keeper

The droplet of water keeps knocking on it without thinking of the consequences, and waits for the day to see an opening in the rock so that it may find a passage and unite with the water already present in the rock.

An old man was on his death bed when he asked his grandchild to recite verses from the Holy Quran that the child had memorised by heart. The boy read the chapter *Al-Mulk*. Once done, he was asked again to recite it, and then again, until he had read it three times. On the third time, the grandfather said, "Son! I bless you with the knowledge and blessings that I have, of which some have been passed on to me by my ancestors."

Through this, the child was blessed by his grandfather at a very young age.

This story is of a noble family from Kunduz, a city in Afghanistan which birthed an enlightened soul whose light warms hearts with knowledge around the globe, even today.

Syed Ali Ghawas Tirmizi (RA) was born in 908 Hijri (1502 CE) in Termez, a village of Kunduz. Unlike other children, he used to contemplate and remain in deep thoughts. Therefore, out of love, his family used to call him "passionate" as a nickname.

His grandfather, Syed Ahmed Noor (RA) was considered a very respectable man in the community due to his moral values. He was very kind to his grandchild, Syed Ali Ghawas Tirmizi (RA). Syed Ahmed Noor (RA) would immediately correct any family member if they teased Syed Ali Ghawas Tirmizi (RA) by calling him "passionate". He would say, "You worldly people have no idea of the worth and status of this passionate child."

Syed Ali Tirmizi (RA) was very attached to his grandfather. He acquired his initial education from him and studied many books on spirituality under his supervision. He says, "The light of worshipping and performing spiritual exercises was initially lit in me by the attention of my enlightened grandfather."

After the passing of his grandfather, Syed Ali Ghawas Tirmizi (RA) felt very lonely, so much so that bewilderment took over him. He felt no charm or attraction in anything. His appetite left him and he found it unable to concentrate, both on his job and his spiritual exercises.

Syed Ali Ghawas Tirmizi (RA) lived during the Mughal era, and his father, Syed Qambar Ali was more interested in the affairs of the country and the royal court, as he held an important designation in the Mughal empire. The empire had awarded him with the title of "*Ameer-e-Nazar Bahadur*" (Honourable Watchkeeper).

There has come upon *Insan* (humans), a period of time where *Insan* was merely a sketch – a sketch devoid of features. When God intended to activate senses in the creations, the features related to those senses developed on the sketch i.e. eyes, nose, ears, limbs, etc. These features became a source of identification between all creations.

God facilitated the creatures with the senses to live in the countless worlds. There is a commonality and coordination in these senses, but in this coordination lays a secret, that the power to exercise authority is a dwelling of two bodies in a single body. The knowledge of the will of God is known to one, and the other body is merely an illusion. In other words, every creation consists of two units out of which one is dependent. The person who is aware of the knowledge of the other unit is known as *Insan* (human), a being that is different to an *aadmi* (man).

• • ——————————— • •

The Lord of all the worlds says that the creation of man is comprised of filth, sounding clay, and mud. However, an *Insan*, as per the words of the Lord, is *Ahsan-e-Taqweem. Ahsan-e-Taqweem* is a status of *Khalifat al-Arz* – the Vicegerent on Earth with distinct powers given by God. The term *Khalifat al-Arz* shows us that *Aadmi* and *Insan* are two dimensions. The sphere of an *Aadmi* is equivalent to that of animals, whereas an *Insan* is the best of all creations.

Read this secret with full concentration. God has graced all creatures with authority, but this authority has two dimensions. One of the dimensions fuels life and propels movement in the body. The divine books describe this dimension of life as Vicegerency. When the children of Adam are distant from the reality, they restrict themselves to being an *aadmi*. In contrast, when they associate themselves with the reality, they elevate to the rank of an *Insan*. Distance from reality is the domination of space, whereas nearness to reality is the dominion of time.

> "Surely We created man of the best stature. Then We reduced him to the lowest of the low." (Quran, 95:4-5)

May God protect you.

also be defined as colour which expresses itself in time.

The universe prior to its creation: Human + Period + Time + Thing + Unmentioned

The universe after its creation: Human + *Imshaaj* (Mixture) + Sperm + Creation + Test + Hearing + Speech + Path + Guidance + Gratefulness + Ungratefulness

Life and time are common elements in the above equations, however, the difference between the two equations is of the senses. The word *Imshaaj* signifies the presence of colours and their alternation. Colour and alternation can be comprehended as an attribute of recurrence and remoteness.

God has stated *dahar* a plane that is beyond this universe. This plane is also called timelessness. When the programme of the universe manifested from formless into form, time came into being. We, the creatures, see this time in the form of a void. The void is not visible to the restricted senses, and yet the foundation of everything is erected upon it. A sperm is a drop that acts as a shell or cover. Every shell has a void. When senses are activated in this void, one is able to see and hear. Each shell contains impressions that undergo different phases, and then transmute into different things like an elephant, a grain or a man. In other words, imprints prior to their descent are in a disarray, and take form only when they descend.

• • ——————————— • •

Let us re-read the 'Message of the Day' with contemplation.

When God intended to manifest the universe, He commanded, "*Kun*". The programme concealed in His will manifested. This proclamation reveals that God is addressing something that already exists. His words stirred motion in the creatures who were unaware of their existence before then. From this we uncover a law that things become worthy of mention only when they receive information of their presence. Once they are noticeable, they become a small part of a larger programme. However, this small part encapsulates everything the larger part contains. To elucidate, it is like an atom in the universe and a universe present in an atom, or the formulae of creation present in water and the presence of water found in all the creations.

Manifestation is the demonstration of space or dimensions. When dimensions firmly establish themselves in materiality, time goes into the background. If an object remains in time, and its features do not surface, it remains non-existent or unmentionable for that particular observer. The conscious mind understands time only if it is explained through the medium of space.

awareness of a woman is at the back of their mind, and when a woman is before them, there is an awareness of a man in the viewer's mind. When something is seen in the light of the other, this does not amount to seeing. In this scenario, the viewer has not tried to figure out what a man is or what a woman is, rather they have identified them through their opposites. We see everything through preconceived notions, which hide the reality.

If an object is seen in dimensions, its identity becomes ambiguous. In the life of paradise, when Adam and Eve remained distant from the prohibited tree, they were screened from doubt. Upon nearing the tree, they witnessed the phenomenon of changing colours in it. This made them uncertain about the tree's identity, and hence shrouded their senses with doubt. As a result, the presence of the tree diminished and the alternation of colours took its place in their mind. Since colours have an inborn attribute of alternation, the phenomenon of alternation became their sight.

Explanation: The material body originates from a sperm and sperm is a form of water. When sperm solidifies, it turns into a clot, which further transmutes into flesh, bones and muscles. After forming into a baby, the body transfers from one zone to another. With every passing day, the body goes through subsequent changes until it eventually reaches the point where the proportions of life assigned for the individual in this world are exhausted. After dispersion, the body of flesh and bones dissolves into water and finally evaporates. However, the deceased remains in the memory of those who knew them. When their loved ones think of them, their image surfaces in their minds. This fact shows us that the individual has not ceased to exist, rather, the colours in which they were present in the material world have been concealed.

Generally, the image of the deceased person in their mind appears similar to how the loved ones knew them in the material world. This is because the relatives are unfamiliar with the attire of the other zone, and therefore see the departed soul through the coloured filters of this world.

The Creator of the universe says,

> "Has there (not) come upon man a period (*dahar*) of time when he was not a thing (even) mentioned? Indeed, We created man from a sperm-drop mixture that We may try him; and We made him hearing and seeing. Indeed, We guided him to the way, be he grateful or be he ungrateful." (Quran, 76:1-3)

This verse explains that prior to the existence of the universe, there was a span of time where space was dormant. However, when the universe came into being, the dormant space rose to dominance. Space can

Message of the Day

Time and space bear the record of everything that came into form since the inception of this universe. Things that we see and do not see, are all inscribed in space, and they become visible when one attempts to see them. If an individual does not try to observe, things remain undiscovered across time and cease to exist for unobservant despite their presence.

What does it mean to see and not see? Seeing is to accept the presence of something, however, not being able to see something does not negate its existence. The affirmation or negation is itself an assertion of a being. For the sight to grasp anything, it is pertinent that the dimensions (features) of an object are dominant. No matter how vast the scope of sight is, the eye detects things only when the features latent in the subconsciousness descend into the space of consciousness to a certain extent.

One cannot claim to have seen the sky by looking towards it. As we are accustomed to seeing things in dimensions and dimensions are masked in the sky, when we look up, our eyes capture the void that exists between us and the sky. In the same vein, when the lens of an eye or a camera is maximised to its full potential, the scene appears blur. Blurriness is also a form of vision that acts as a veil between the viewer and the view.

The earth is the opposite facet of the sky, but despite being a symbol of finitude, it is infinite in its bounds. If one stands in the middle of a vast plain with no structure around, they cannot discern directions. Buildings placed on the land give birth to directions, which we have named East, West, North, and South.

A restricted person sees the earth divided in units. They think of the distance between two houses, or the space between four walls as earth. However, this is not an accurate definition of the earth, because they have only seen a portion of it and remain oblivious to its true nature.

Finitude is the only aspect that the conscious mind is aware of, therefore, it also sees the infinite through the limited lens of the consciousness. People tend to observe things in perspective of other things. That is to say, while understanding one thing through another, they perceive two dimensions simultaneously. However, to see one facet with the help of its opposite facet, is not the correct way to see things.

Example: Male and female are two dimensions in all creatures. They are known through their opposites. When one looks at a man, the

Contents

Message of the Day	K. S. Azeemi	172
A Secret Keeper	Muhammad Zeeshan	168
Oneness	Bibi Anuradha (UAE)	162
Physical Record of the Mind	Dr. Muzaffaruddin	158
The Borrowed Child	Roshan Sitara	152
Prophet Jesus (PBUH)	Extracted	149
What Do We See?	Dr. Naeem Zafar (Ph.D.)	146

"Intellect takes you to the door, but
it does not take you into the house."
-- Hazrat Shams Tabrezi (RA)

Vol 7 Issue 8 | September 2019 | Muharram _ Safar 1441AH

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Monthly Karachi

Qalandar Shaoor

Neutral Thinking

(Urdu — English)

Patron in chief

Huzoor Qalandar Baba Auliya RA

Chief Editor

Khwaja Shams al-Din Azeemi

Editor

Hakeem Salam Arif

Circulation Manager

Muhammad Ayaz

Furnished by Azeemi University Press. Shah Alam Azeemi, the Publisher has published it at Ibn-e-Hasan Offset Printing Press, Hockey Stadium, Karachi and disseminated at Surjani Town Karachi.

Rs.70/- Per issue. Annual subscription Rs.950/- with Reg. Post (Domestic), US$ 60/- (International)

Contact: B-54, Azeemi Mohalla, Sector 4-C, Surjani Town Karachi, Pakistan. Ph: +92 (0)213 6912020